لفظوں کا پیرہن

لفظوں کے پیرہن سے سجایا ہوں ہر خیال
یادوں کی انجمن یہ ہمیشہ سجی رہے

حفیظ انجم کریمنگری

سنہ اشاعت	جنوری سنہ ۲۰۰۱ء
نام کتاب	لفظوں کا پیہ
نام مصنف	حفیظ انجم کر
کتابت	تنویر واحدی
سرِ ورق	خان انجم
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پر حیدرآباد
تعدادِ اشاعت	پانچسو
قیمت	سو روپیہ

ملنے کا پتہ

حفیظ انجم ۷-۲-۷۷۵ کشمیر گڈہ کریم نگر

فون نمبر ۴۹۳۱۹

حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد

جزوی تعاون اردو اکیڈمی آندھرا پردیش۔ حیدر

انتساب

"لفظوں کا پیراہن" کو میں اپنی شریکِ حیات
آسیہ انجم، صاحبزادی رابعہ انجم، صاحبزادہ رؤف غزالی
انجم، رافع انجم اور صاحبزادی منہاج انجم کے نام
معنون کرتا ہوں جنکے خلوص و محبت کی مہک
میری سانسوں کو مہکا رہی ہے۔

حفیظ انجم کریم نگر

پیش لفظ

"لفظوں کا پیرہن" حفیظ انجم کریم نگری کا پہلا مجموعۂ کلام ہے وہ گذشتہ پچیس ۲۵ برسوں سے صنفِ غزل میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اُردو کے علاوہ تلگو اور ہندی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلیات میں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ اور تراکیب کا بھی برموقع اور موزوں استعمال ملتا ہے۔

غزلیات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ انجم نے غزل کی قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے موضوعات کو بھی جگہ دی ہے۔ محبوب کے حسن و ادا' اُس کی بیوفائی کے شکوے کے علاوہ سیاسی' سماجی' معاشی اور اخلاقی موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ انسانی زندگی میں رونما ہونیوالے مختلف واقعات اور حادثات بھی غزل کا موضوع ہیں۔ کلام میں ہندی کے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے استعمال سے شعر کے حُسن میں اضافہ ہوا ہے ذیل کے اشعار میں ہندی الفاظ بہت خوبصورت لگتے ہیں ؎

وہ اُٹھ کے پہلو سے جا رہے تھے ؛ سمے کا پنچھی ٹھہر گیا تھا

اُڑان بھرنے لگے ہیں غلط دشاؤں میں ؛ کبوتروں کے ذرا بال و پر کترنا ہے

اشعار میں پُرسکار' نرمان' چھل' پروائی' اگنی پریکشا' سمے' سگندھ یُگ' سندرتا اور ایسے کئی ہندی الفاظ ملتے ہیں اس سے ہندی زبان پر

قادر ہونیکا ثبوت ملتا ہے۔

حفیظ انجم نے دوست کی نفسیات کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ مشاہدہ تیز ہے اس لئے اُس کے ہر روپ سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ محتاط بھی رہتے ہیں۔ ایک شعر میں اُن لوگوں پر طنز کیا ہے جو دوستی کا لبادہ اوڑھے بیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں ؎

دوستو! آپ سے ہے خوف مجھے ٭ دشمنوں سے تو مجھکو ڈر نہ لگا

ایک اور شعر ہے ؎ دشمنوں میں ہماری بڑی ساکھ ہے ٭ دوستوں میں ہمیشہ اچھالے گئے

دوست کا خلوص بہا جاتا ہے تو ان کے قلم سے ایسے اشعار بھی موزوں ہوتے ہیں ؎ مری پسند مری ناپسند کچھ بھی نہیں ٭ بس اخلوص ہی پیارا ہے کیا کیا جائے

حفیظ انجم نے قومی یکجہتی، مذہبی رواداری پر بھی بے مثل اشعار لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎ نہ حرف آئے کبھی ایکتا پہ اے بھائی

ہمیں تمام مذاہب سے پیار کرنا ہے

ایک اور شعر ہے ؎ مندر مسجد مجھ میں ہیں ٭ اک سیدھا انسان ہوں میں

اخلاقی موضوعات پر بھی مجموعۂ کلام میں کئی اچھے اشعار ملتے ہیں ؎

یہ انتہائی ضروری ہے ہر بشر کیلئے ٭ دل ونگاہ میں پیدا تو انکساری کر

سبھی کی سنتا ہوں نہیں ہے بُرے عمل پر لگانا قدغن

یوں اپنا دامن بُرائیوں سے بچائے جانا بچائے جانا

حفیظ انجم کے مجموعۂ کلام "لفظوں کا پیرہن" کے کئی اشعار نے

مجھے متاثر کیا۔ چند منتخب اشعار پیش ہیں ؎

زندگی ایک بار ملتی ہے ٭ جب ملی ہے تو احترام کرو

یوں کب تک اوڑھ کر سوتے رہوگے ٭ غیر بھی پاؤں پھیلانے لگی ہے

کیوں مرے خون کا پیاسا تو نظر آتا ہے ٭ سچ بتا تیرا مرا خون کا رشتہ بھی نہیں

ٹھہرے پانی کو چھیڑتے کیوں ہو ٭ صاف چہرہ بکھر نہ جائے کہیں

ریت کے ٹیلے کو ہم نے ریت کا ٹیلہ کہا ٭ اسلئے شہرت ہماری چار سو ہوتی نہیں

چھت پر کھڑے مکان کے کہتا تھا اک بشر ٭ اے آسمان دیکھ میں کتنا بلند ہوں

مجموعۂ کلام کے آخری صفحات پر چند نظمیں ہیں۔ انمیں نظم "اردو" قاری کو متاثر کرتی ہے، خصوصیت سے ذیل کا یہ شعر جسمیں اردو زبان سے کیگئی ناانصافی کی شکایت ہے ؎

ہر زمانے میں ہوں ستائی گئی ٭ ایک مظلوم ہوں میں اردو ہوں

اسکے علاوہ ماں، جشن آزادی اور عید کا دن اچھی نظمیں ہیں۔

مستقبل میں حفیظ انجم سے اچھی توقعات رکھی جاسکتی ہیں۔ یقین ہے کہ وہ شعر گوئی کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے خوب سے خوب تر کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ مجموعۂ کلام کی اشاعت پر میں انھیں دلی مبارکباد دیتی ہوں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء
سابق صدر شعبۂ اردو
یونیورسٹی کالج فار ویمنس
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

حفیظ انجمؔ
زندگی کا ترجمان شاعر

از غلام خواجہ معین الدین گوہرؔ کریم نگری
ایم اے بی ایڈ ایل ایل بی
صدر بزمِ شاہین کریم نگر
۲-۸۰۳-۷ کشمیر گڈہ کریم نگر اے پی ۵۰۵۰۰۱

میرے تلامذہ میں نمایاں شخصیت کے حامل حفیظ انجم جن سے تقریباً سارے ادب دوست حضرات واقف ہیں اور جن کا کلام ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے ماہناموں اور روزناموں میں آئے دن شائع ہوتا رہتا ہے۔ اسطرح وہ لوگ بھی حفیظ انجمؔ کے نام سے واقف ہیں، جو انھیں شخصی طور پر نہیں جانتے۔

حفیظ انجمؔ بڑی خاموش طبیعت کے مالک ہیں اور ان کا چہرہ کھلی کتاب ہے۔ چہرے کے تیور سے حالِ دل صاف صاف بیان ہوجاتا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ اساتذہ کے کلام کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "میں نے اپنے استاد حضرتِ گوہرؔ کے کلام کو جسطرح سمجھا ہے، شاید ہی کوئی سمجھے"۔ روزمرہ کے حالات، تجربوں اور زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو یہ اپنے کلام میں سموتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں گل و بلبل کے افسانے مشکل سے ملیں گے۔ بزرگوں کا احترام کرتے ہیں تو بچوں سے پیار بھی ان کی سرشت میں داخل ہے۔

یہ ہماری بزم "بزمِ شاہین" کے معتمدِ مشاعرہ ہیں۔ مشاعرہ میں شعراء و سامعین سے ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ اچھے شعر پر ضرور داد دیں تاکہ شاعر کی حوصلہ افزائی ہو اور مشاعرہ [illegible]

اُن شعراء کا بجا طور پر گلہ کرتے ہیں جو خود تو داد کے طالب ہوتے ہیں لیکن دوسروں کو داد دینا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی بیوی بچوں کو اللہ پاک کا عطا کردہ بے بہا اثاثہ تصور کرتے ہیں۔

ان کا کلام چرند پرند، دشت و آبادی، بچے اور والدین، نفرت و مُحبت، روشنی و تیرگی، تہذیب و ناشائستگی، وفا و جفا، غریب و امیر کے حالات سے بھرا پُرا ہے۔ لہٰذہ میری نظر میں "حفیظ انجم زندگی کا ترجمان شاعر ہے"۔ صاف ستھرے اور دل میں اُتر جانے والے سہل الفاظ کو مؤثر پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ کم پڑھا لکھا بھی ان کا شعر پڑھ کر یا سُن کر لُطف اُٹھاتا ہے۔ حفیظ انجم حمد اور نعت بھی بڑے سلیقہ سے لکھتے ہیں۔ اِن کے عام فہم اشعار محفل میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ انشاءاللہ سال دو سال میں ان کی نعتوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آسکتا ہے۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لفظوں کا پیرہن" عام بول چال کی زبان سے مزین ہے۔ ایسے الفاظ جن کے سمجھنے کیلئے لُغات دیکھنی پڑے ان کے ہاں "نہیں" کے برابر ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ حفیظ انجم مستقبل قریب میں کریم نگر کا ایک بہترین شاعر ثابت ہوگا۔ اور لوگ آپ کی قدر کریں گے، اسلئے بھی کہ یہ دلوں کی بات کہتے ہیں اور اس لئے بھی کہ لوگ ثقیل الفاظ

کو جاننے سے قاصر ہوتے جا رہے ہیں۔

میں خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہوں کہ وہ ان کو درازیٔ عمر کے ساتھ صحت و عافیت اور دولتِ دارین سے سرفراز فرمائے۔ آمین

آخر میں ان کے وہ اشعار پیش کر رہا ہوں جو مجھے پسند ہیں اور مجھے یقین ہے کہ قارئینِ کرام بھی پسند فرمائیں گے

سے میری دنیا میں چلے آؤ اُجالا لیکر ؎ اور ہم چل کے اندھیروں میں یہ تقسیم کریں

بانہوں میں بانہیں ڈال کے پھرتے ہیں موت کی
انجم ہمارے دم سے ہے مقتل کا بانکپن

جی چاہتا ہے اُس کو کتابوں کی شکل دوں
ہر آدمی سے مجھ کو ملا جو نیا سبق

ہر ایک شخص کے اندر جو سوکھا جنگل ہے ؎ بغیر آگ کے جلتا ہے کیا کیا جائے

آج کا حال کر رہا ہے رقم ؎ مجھ میں جو فاہیان ہے بابا

اِک بار جھوٹ کہنے کی اتنی ملی سزا ؎ پھر میرا اعتبار کسی نے نہیں کیا

امن پر بھاشن ہوا تھا رات بھر نیتاؤں کا ؎ خون میں لت پت ملا ہے صبح کا اخبار کیوں

ہمارے گاؤں میں اُن کا شمار کچھ بھی نہیں ؎ تمہارے شہر میں یہ لوگ معتبر کیسے

تم کیسے بھلا مرد ہو افسوس ہے تم پر ؎ ہر وقت طوائف کی طرح سجنے لگے ہو

یوں کب تک اوڑھ کر سوتے رہو گے ؎ غریبی پاؤں پھیلانے لگی ہے

جوان بیٹا ہو سب مزے سے گھر میں ہیں
یہ بوڑھی ماں ہے اکیلی جو سائیاں میں ہے

گوہر کریم نگری

حرفِ جمیل

سرزمینِ دکن اُسی وقت شعر و ادب کی دولت سے مالا مال ہوگئی تھی جب یہاں صوفیائے کرام کے قدم پڑے۔ اُن بزرگوں نے علم و فن کے خوب خوب کمال دکھائے۔ صرف صوفیائے کرام ہی کیا بلکہ اس دور کے بیشتر حکمران بھی شعر و ادب کے قدر دان ہی نہیں خود ادیب و شاعر ہوئے۔ گولکنڈہ کا بادشاہ اور بانیٔ شہرِ حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ حیدرآباد شہر بساتے ہوئے دُعا کی تھی کہ میرے شہر کو یوں آباد کر جیسے سمندر کو تو نے مچھلیوں سے آباد کیا ہے۔ ایک بادشاہ کی دُعا مقبول ہوئی چنانچہ آج شہرِ حیدرآباد کی آبادی ساٹھ لاکھ سے زائد ہے۔ یہ بادشاہ چونکہ شاعر بھی تھا اسلئے یہ ایک شاعر کی دُعا بھی تھی اسلئے حیدرآباد میں کئی باکمال شاعر پیدا ہوئے اور دیگر علاقوں سے آکر بھی یہاں کئی شاعر بس گئے۔ چنانچہ حیدرآباد علم و ادب شعر و سخن کا گہوارہ بن گیا؛ اور اُسکے اثرات حیدرآباد کے قرب و جوار کے اضلاع پر بھی پڑے اور اضلاع میں بھی ادبی ماحول گرم رہا اِن ہی اضلاع میں کریم نگر بھی شامل ہے؛ جہاں شعر و ادب کی سرگرمیاں ہمیشہ جاری رہیں۔ یہاں کے ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں جن بزرگوں نے اہم رول ادا کیا ہے اُن میں حضرت

ناصر کریم نگری مرحوم حضرت صابر توکلی شاہین مرحوم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن حضرات کے بعد کریم نگر کے ادبی ورثہ کی حفاظت کی ذمہ داری حضرت گوہر کریم نگری نے اپنے سر لی ہے اور گوہر صاحب کے دستِ راست اور شاگردِ خاص کی حیثیت سے جناب حفیظ انجم کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

حفیظ انجم نے ستر کے دہے میں شعر کہنا شروع کیا اور پوری دلجمعی سے شعر و سخن کی خدمت کیلئے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ بزمِ شاہین کریم نگر کی فعال اور کارکرد ادبی انجمن ہے جو ربع صدی سے زائد عرصہ سے ہر مہینہ ایک طرحی مشاعرہ منعقد کرتی آرہی ہے۔ حفیظ انجم روزِ اوّل ہی سے اس بزم سے وابستہ ہیں اور اس کے معتمدِ مشاعرہ ہیں؛ اور ہر مہینہ طرحی غزل پابندی سے کہتے اور مشاعرہ میں سناتے آرہے ہیں۔ یعنی اتنے برسوں سے شعر کہنے کی مشق جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور اب اِن کے کلام میں پختگی کا آجانا فطری بات ہے اور اُن کے یہ شعر اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ؎

میری باتوں میں صندلی ہے مہک
ذکر اُسکا ہے بات اُسکی ہے

میں انجم آنکھ کیسے پھیر لیتا
نظر بھر کر ضیافت سامنے تھی

نہ جانے آج کیا ہے ہوشیار لا
طبیعت میری گھبرانے لگی ہے

یاد آتی ہے دبے پاؤں تیری جب دلمیں ؛ رات بھر شمع کی مانند جلا کرتے ہیں
بچا بھی کیا ہے مرے پاس سونپنے کیلئے ؛ میں دے چکا ہوں تجھے اپنا سب شبِ ہجراں
میرے اندر جھانک کے دیکھ ؛ بوجھ مجھے آسان ہوں میں

اِس دور کے اکثر شعراء کی طرح حفیظ انجم نے بھی اپنی شاعری کی شروعات غزل ہی سے کی ہے اور غزل ہی ان کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ غزل کے کوزہ میں سمندر سما سکتا ہے اور آج غزل واقعی ایسا کوزہ ہے جس میں سمندر سما جائے۔ میر تقی میرؔ سے آج تک غزل میں کتنے ہی مضامین و موضوعات داخل ہو گئے۔ غزل کو لیکر کئی تجربے کئے گئے لیکن غزل کے بانکپن کو متاثر نہ کیا جا سکا بلکہ حفیظ انجم کی طرح خلوصِ دل سے غزل کہنے والے شعراء نے غزل کو اپنا خونِ جگر دیا ہے اسکی آبیاری کی ہے اور اسے سنوارا ہے۔ ؎

میں چھو کے گل کو جو محسوس کرتا رہتا ہوں
وہ تازگی تو کسی کے بدن میں آئے کبھی

تمہارا طرزِ تکلم کہ چلتا جادو ہے
ہم آج بھی اسی لطفِ بیاں کی قید میں ہیں

تمام یادوں کے پھر سے دیئے ہوئے روشن
ہوا ہے آپ سے جو آج سامنا میرا

حفیظ انجم نے جب غزل کہنا شروع کیا وہ ایسا وقت تھا جب ترقی پسند تحریک دم توڑ چکی تھی اور اُس کی جگہ جدیدیت نے اپنے لئے راہ بنائی تھی۔ حفیظ انجم کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ اُنھوں نے نہ ہی غزل کی روایت سے اپنا ناطہ توڑا اور نہ ہی جدیدیت کو گلے لگایا بلکہ اپنے لئے اِن دونوں کے درمیان کا راستہ چُنا جس پر چل کر ان کی غزل متوازن ہو گئی ہے

میں جُدائی کے تصور سے لرز جاتا ہوں ؂ ایک پل تجھ سے جو بچھڑوں گا تو مرجاؤں گا

شہر میں جب سے آ بسے ہیں ہم ؂ چھاؤں ملتی نہیں شجر والی

شیشہ گر تھے ہم بھی اپنے گاؤں میں ؂ پتھروں کے شہر میں پتھر بنے

وقت کی دھوپ نے حفیظ انجم ؂ دیکھو کتنا بدل دیا چہرہ

بھائی میرے جا چکے تھے مجھکو تنہا چھوڑ کر ؂ وقت کے اندھے کنویں میں کوئی بھی میرا نہ تھا

حفیظ انجم کی غزل کے موضوعات رومانی نہیں ہیں۔ اُن کی غزل حالات کا شکار نظر آتی ہے۔ اُسکے موضوعات میں معاشرہ اور اُسکے عناصر وعوامل در آئے ہیں۔ انجم اپنی کھلی آنکھ سے جو دیکھتے ہیں وہ شعر کی صورت میں کاغذ پر اُتار دیتے ہیں۔ بقول ساحر لدھیانوی

؎ دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں ؂ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

حفیظ انجم کی شاعری اپنے معاشرہ کا آئینہ ہے وہ وہی قلمبند کرتے ہیں جو اُن کے گرد وپیش میں ہوتا ہے ؎

آج کا حال کر رہا ہے رقم ❊ مجھ میں جو فاہیان ہے بابا

شیئر بازار ہے سیاست بھی ❊ اِس کا تم اعتبار مت کرنا

اِک گھٹن ہے عجیب سی انجمؔ ❊ جو دلوں میں دلوں سے اُتری ہے

لاشوں کے ڈھیر اور یہ جلتے ہوئے مکاں ❊ حیوانیت کا آپ کی اظہار بن گئے

آگے بونوں کی بھیڑ ہے انجمؔ ❊ اپنی گردن ذرا سی خم کر لو

حفیظ انجمؔ کی غزلیں سہلِ ممتنع کا اچھا نمونہ ہیں۔ سیدھا سادا انداز بیان۔ نہ ابہام کے چکر نہ علائم کے اُلجھاؤ۔ اسلوب بیان آسان و پُر اثر۔ یہ غزلیں اپنے قارئین میں اسکے شاعر کو یقیناً مقبول بنائیں گی کیونکہ شاعر میں عزم بھی ہے حوصلہ بھی ہے

اب آسمان چھونے چلا ہے یہ دیکھئے ❊ انجمؔ بلا کا جوش پرندے میں آگیا

میں سانجھ ہوں نہ کوئی نئی سویرا ہوں ❊ ہوں ایک عزم کا سورج مجھے اُبھرنا ہے

اُمید ہے کہ حفیظ انجمؔ کے اس پہلے شعری مجموعہ کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

۲۷ نومبر ۲۰۰۰ء

جمیلؔ نظام آبادی ایم۔اے
مدیر "گونج"
نظام آباد

کچھ اپنے بارے میں

۱۹ / نومبر ۱۹۴۸ء میں ضلع کریم نگر کے متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ میں دسویں جماعت کامیاب کیا ہی تھا کہ والدہ صاحبہ محترمہ جمال النساء بیگم کا سایا سر سے اُٹھ گیا۔ میں پی۔ یو۔ سی کامیاب ہوکر ملازمت کیلئے مارا مارا پھر رہا تھا کہ والدِ محترم جناب محمد عبدالجلیل صاحب کا سایا بھی سر سے جاتا رہا۔ میں یتیم و یسیر ہو چکا تھا۔ ایک چھوٹا بھائی اور دو بہنیں بھی تھیں۔ لیکن میرے ماں باپ کی دُعائیں اور اللہ تعالیٰ کا کرم تھا مجھے جلد ۱۹۷۵ء میں ملازمت مِل گئی۔ میں ڈسٹرکٹ ٹریژری آفس میں سینیئر اکونٹنٹ ہوں۔ ۱۹۷۷ء میں میری شادی ہوئی۔ میری شریک حیات محترمہ آسیہ انجم معلمہ ہیں۔ میں اِن پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ اُنھوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ میری خوشی کو اپنی خوشی جانا اور میرے غم کو اپنا غم سمجھا۔ شاعری کیساتھ اس شاعر کو قبول کیا۔ میں اپنے بھائی اور بہنوں کی شادیاں کر کے اپنے فرائض سے بفضلِ خدا سبکدوش ہو چکا ہوں۔ سب اپنے گھروں میں ہیں اور مزے میں ہیں۔

میرا ذریعۂ تعلیم دسویں جماعت تک تلگو میڈیم رہا ہے البتہ پی۔ یو۔ سی انگلش میڈیم سے کامیاب کیا۔ ملازمت سے منسلک ہونیکے بعد عثمانیہ سے گریجویشن کی تکمیل تلگو میڈیم سے کی، اور پھر ایم ۔ اے

اُردو میسور یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ میں نے باضابطہ اُردو کبھی نہیں پڑھی، صرف عربی تعلیم سے اُردو سیکھی ہے۔ اُردو زبان سے آشنائی میری ذاتی محنت سے دلچسپی ہے۔ اور صرف مطالعہ ہی میرا رہبر ہے۔ صغیر سنی ہی سے مجھے شعر و شاعری کا شوق رہا ہے حالانکہ میرے افرادِ خاندان میں دور دور تک ایسا کوئی نہیں ہے جسے شعر و شاعری سے دلچسپی ہو یا پھر خود شاعر ہو۔ پتہ نہیں مجھ میں یہ اُنکُر کیسے پھوٹا۔ اس کو میں قدرت کا عطا کردہ انمول تحفہ سمجھتا ہوں۔ کامریڈ مخدوم محی الدین مخدومؔ کی صدارت میں شاید سنہ ۱۹۷۰ء میں کریم نگر میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا تھا میں جب تک یہ نہیں جانتا تھا کہ مشاعرہ کس چڑیا کا نام ہے۔ مشاعرہ بہت خوب لگا۔ اس مشاعرہ میں مقامی شعراء حضرت شاہینؔ و گوہرؔ کو بھی سنا۔ ان کا کلام مجھے بہت پسند آیا۔ تب سے مجھے بھی شعر کہنے کی للک پیدا ہوئی میں اپنی پہلی نظم بہ عنوان "ماں" کہکر حضرتِ گوہرؔ کی خدمت میں رجوع ہوا۔ اور تب سے آج تک اُن ہی سے اصلاحِ سخن جاری ہے۔ آپ ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک شفیق اُستاد بھی ہیں۔ آپ شاعر کے خیال کو مجروح نہیں ہونے دیتے خیال اور الفاظ بھی وہی رکھکر اصلاح دیتے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ سبھی شاگرد آپ کے مُطیع بھی ہو جاتے ہیں۔ میرا آپ کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو دیا دکھلانے کے مترادف ہوگا۔ آپکا وجود ہم کریم نگر والوں کیلئے دولتِ غیر مترقبہ ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دِن میں خود آپ کے پاس چلا جاتا ہوں یا آپ خود میرے غریب خانہ تشریف لے آتے ہیں۔ اسلئے بھی کہ ہم آپسمیں رشتہ دار ہیں۔ لیکن بات چیت ہمیشہ شعر و شاعری کی، علم و فن کی عروض و آہنگ کی ہی ہوا کرتی ہے۔ رشتہ داری بالائے طاق رکھدی جاتی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے، آپکا سایا ہمارے سروں پر سدا سلامت رکھے۔ آمین ثمہ آمین۔ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میرے کلام پر تبصرہ فرمایا اس کیلئے جناب کا احسانمند ہوں۔

میں ہمیشہ روایتی شاعری سے ہٹ کر کہنے کی کوشش کرتا ہوں وقت و حالات کو زندگی کی تلخیوں کو قلمبند کرنیکی کوشش کرتا ہوں جو آنکھ دیکھتی ہے جو دل کہتا ہے وہی لکھتا ہوں۔ میں خیال کو کہیں دور سے کھینچ تان کر لاتا ہوں نہ تو تصورات کی دُنیا میں کھویا رہتا ہوں۔ میں "آج" کا شاعر ہوں، میں "آج" ہی میں بھرپور جینا چاہتا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ "آج" کا بھرپور عکاس بنوں۔ میں ۱۹۷۰ء سے شعر کہتا ہوں لیکن

اس مجموعۂ کلام لفظوں کا پیرہن میں ۱۹۷۵ء سے ڈسمبر ۱۹۹۹ء تک کا منتخب کلام ہی پیش کر رہا ہوں۔

اُردو میری مادری زبان ضرور ہے لیکن میں اُردو لکھنے پڑھنے سے بالکل نابلد تھا۔ اُردو سیکھنے میں مجھے کڑی محنت اور تگ و دو کرنی پڑی۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، میری ماں کی دُعائیں ہیں، میری محنتوں کا نتیجہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسمیں غلطیاں نہیں ہیں۔ یہ تو کلامِ بشر ہے۔ اغلاط سے پاک تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن ہی ہوتا ہے۔ میں ہندوستان بھر کے مختلف رسالو میں ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی کئی ماہناموں میں شائع ہوتا رہتا ہوں۔ بزمِ شاہین کریم نگر کے بانیوں میں سے ایک ہوں۔ اس بزم کا معتمد مشاعرہ بھی ہوں جو کہ ہر ماہ پابندی سے طرحی و غیر طرحی مُشاعرہ مُنعقد کیا کرتی ہے۔ اب تک ۲۶۰ دوسو ساٹھ ماہانہ طرحی و غیر طرحی مُشاعرے منعقد کئے جاچکے ہیں۔ اکثر باہر کے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جاتا ہوں۔ میں غزل کے ساتھ ساتھ حمد و نعت بھی کہتا ہوں۔ انشاءاللہ العزیز بہت جلد نعتیہ مجموعۂ کلام جمالِ مُصطفیٰ بھی منظرِ عام پر آجائے گا۔

میں اُردو اکیڈمی حیدرآباد کا مشکور ہوں جسکی جُزوی مالی اعانت

سے میرے اس مجموعۂ کلام لفظوں کا پیرہن کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ اس ضمن میں جناب صلاح الدین صاحب نیرؔ کا بھی تعاون رہا ہے ورنہ میرا یہ خواب بہ آسانی شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتا۔ ان کا بھی میں ممنونِ کرم ہوں۔ لفظوں کا پیرہن کا سرِ ورق کے ڈیزائنر بھائی خان انجمؔ کا اور میرے شاعر دوست بھائی تنویرؔ واحدی کا جو اپنی مصروفیات کے باوجود کتابت کے فرائض انجام دیئے میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔

محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیاء صاحبہ اور جمیلؔ نظام آبادی صاحب ایڈیٹر گونج جو اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میرے مجموعۂ کلام پر گرانقدر تبصرہ فرمایا جس کے لئے میں تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔

بارگہہ ربّ العزت میں دست بدعا ہوں کہ ؎

تیرا بندہ ہے یہ حفیظ انجمؔ
دین و دُنیا کی کامرانی دے

مورخہ ۱۹ ڈسمبر ۱۹۹۶ء
کریم نگر

حفیظ انجمؔ (ایم۔اے)
7-2-775
کشمیر گڈہ کریم نگر ۵۰۵۰۰۱

حمد

جو فضلِ رب تجھے اونچا اُٹھا بھی دیتا ہے
پلک جھپکنے پہ نیچے گرا بھی دیتا ہے

جو سوکھے پیڑ پہ پتّہ ہرا بھی دیتا ہے
خزاں کے آتے ہی اس کو جھڑا بھی دیتا ہے

نوازنے پہ جب آجائے تو حساب نہیں
میں جس کو چھو لوں وہ سونا بنا بھی دیتا ہے

ہے تیری شان نرالی بیان سے باہر
گلوں میں رنگ پھلوں میں مزا بھی دیتا ہے

بڑا رحیم بڑا ہی کریم ہے مولا !!
وہ مشکلوں میں ہمیں آسرا بھی دیتا ہے

بہت پسند ہے اُس کو ادا یہ بندے کی
جو مانگتا ہے اُسی کو خدا بھی دیتا ہے

ہے اپنے اپنے عمل کا صلہ حفیظ انجم
سزا بھی دیتا ہے بے شک جزا بھی دیتا ہے

حمد

ویرانہ آباد ہوا تو تجھ کو پہچانا!
اس میں بھی اک پھول کھلا تو تجھ کو پہچانا!

بوڑھا سورج ڈوب گیا تو تجھ کو پہچانا!
ڈوبا سورج پھر سے اُگا تو تجھ کو پہچانا!

رات کا منڈپ خوب سجا تو تجھ کو پہچانا!
تاروں میں اک چاند کھلا تو تجھ کو پہچانا!

سوکھا پودا ہرا ہُوا تو تجھ کو پہچانا!
پودے کو پھل پھول لگا تو تجھ کو پہچانا!

چھٹنے لگی جب غم کی گھٹا تو تجھ کو پہچانا!
من کا مور ناچ اُٹھا تو تجھ کو پہچانا!

تخم جو بویا تھا کل میں نے اپنے ہاتھوں سے
اس میں سے انکر پھوٹا تو تجھ کو پہچانا!

تیرے کرم کو کیسے بھلاتا انجمؔ بھی
دشمن بھی مانوس ہوا تو تجھ کو پہچانا!

حمد

زیست کا کاروبار تجھ سے ہے
سب کا صبر و قرار تجھ سے ہے

ہر ترقی میں ہے ترا جلوہ!
زندگی شاندار تجھ سے ہے

ان زمینوں کا آسمانوں کا
سارا سولہ سنگھار تجھ سے ہے

موت کا خوف سارا ایک طرف
زندگی کا دُلار تجھ سے ہے

تو امیروں کا تُو غریبوں کا
سب کے دل کی پکار تجھ سے ہے

لہلہاتی ہیں کھیتیاں ہر سو
یہ زمیں لالہ زار تجھ سے ہے

حسن ہی حسن ہے صفت تیری
عشق تو آشکار تجھ سے ہے

زندگی ہو کہ موت ہو یارب
اس کا بس اعتبار تجھ سے ہے

سر جھکاتا ہے انجمِ خستہ!
اس کا سارا وقار تجھ سے ہے

نعتِ رسولؐ

دیتی ہے ہمیں اور جلا آپؐ کی سنّت
کام آئے گی یہ روزِ جزا آپؐ کی سنت

عالم میں ہے بس سب سے بجا آپؐ کی سنّت
قسمت سے ہوئی ہم کو عطا آپؐ کی سنت

تاریکی میں دیتی ہے ضیا آپؐ کی سنّت
"قائم رہے دنیا میں سدا آپؐ کی سنت"

اے گوشۂ تنہائی بتا آپؐ کی سنّت
رہتی ہے سجی دل میں سدا آپؐ کی سنّت

واعظ تری باتوں کا بھرم ٹوٹ چکا ہے
کیا کہتی ہے پہلے یہ بتا آپؐ کی سنّت

عادی ہوں میں سننے کا سدا آپؐ کی سنت
اے بادِ صبا مجھ کو سنا آپؐ کی سنت

منکر ہے وہ فاسق ہے عمل جو نہیں کرتا!
تن من سے کریں آؤ ادا آپؐ کی سنت

بندے کو سکھاتی ہے یہ آدابِ عبادت
تو اور سنا اور سنا آپؐ کی سنت

چلتے رہو چلتے رہو ایمان کو تھامے
انجم ہمیں دیتی ہے بقا آپؐ کی سنت

نعتِ رسول

میں سُن رہا ہوں صدائیں خدا مدینے کی
مجھے بھی سیر کرا دے ذرا مدینے کی

دل و دماغ معطر ہوئے ہیں میرے بھی
ہے یاد جب بھی دِلائی صبا مدینے کی

فضائیں آج بھی اُنؐ کی گیسوؤں کی خوشبو ہے
ہے آج بھی یہ فضا جاں فزا مدینے کی

ہمیشہ نور کی برسات ہوتی رہتی ہے
الگ یہ شان ہے سب سے جُدا مدینے کی

مرے حضورؐ کے نقشِ قدم منقش ہیں
گلی گلی کو شرف یہ مِلا مدینے کی

اندھیرا اور گھٹاٹوپ ہو گئے ہوتے
نہ ملتی ہم کو اگر یہ ضیا مدینے کی

ہے سانس سانس پہ کلمہ مدینے والے کا
ہمیشہ یاد دلاتا رہا مدینے کی

دل و نظر ہی نہیں روح جھومتی ہے مری
سُنا تو اور بھی عظمت سُنا مدینے کی

ہر ایک فرد کے انجم نصیب میں ہے کہاں
کسی کسی کو ملے گی عطا مدینے کی

نعتِ رسول

چاند بھی شرما رہا تھا اُن کا چہرا دیکھکر
دم بخود تھے سب کے سب منظر سہانا دیکھکر

صاحبِ لولاک ہیں وہ حاملِ قرآن ہیں
چاند دو ٹکڑے ہوا تھا اک اشارا دیکھکر

دونوں عالم میں محمد مصطفیٰ کا نور ہے
دل سے میں کہتا ہوں قرآں کا حوالہ دیکھکر

چوم لیتا ہوں لگا لیتا ہوں آنکھوں سے اُسے
نام احمد کا لکھا فوراً تراشا دیکھکر

میری آنکھیں کہہ رہی ہیں مجھ سے ہر دم بس یہی
اور کیا دیکھیں بھلا شہرِ مدینہ دیکھکر

اصل میں نورِ محمد نور ہے اللہ کا
"کس کو دیکھوں جلوۂ سرکارِ بطحیٰ دیکھکر"

ہے کرم اللہ کا لکھوا دیا نعت آپ کی
سب کے سب حیرت میں ہیں میرا قصیدہ دیکھکر

آنکھ پُرنم دل پریشاں اُن کو پھر فرقت کا غم
جو بھی حاجی آرہے ہیں شہر والا دیکھکر

یہ تو آقا کا کرم ہے اپنے اس بیمار پر
قبر میں انجم کھولوں گا میں اُجالا دیکھکر

نعتِ رسول

خزاں کے دور میں فصلِ بہار رقص میں ہے
دِوانہ آپؐ کا دیوانہ وار رقص میں ہے

حضورؐ آپؐ کی آمد کا یہ تصدّق ہے!
گلوں کا ذکر ہی کیا خار خار رقص میں ہے

شہہؐ انام کی آنکھوں میں حق کو دیکھا تو!
عمرؓ سا قتل کا وہ دعویدار رقص میں ہے

جو ساتھ ساتھ رہے اُن کی کیا ہو کیفیت
جہاں رُکے رہے آقا وہ غار رقص میں ہے

اب آنے والا ہے مہمان آسمانوں پر!
اسی خوشی میں ہر اک اختیار رقص میں ہے

میں نعت کہنے کو بیٹھا ہوں جب شہہ بطحا
لباسِ فکر کا ہر تار تار رقص میں ہے

یہ روزِ حشر یہ آقاؐ مجھے دکھا کے کہیں!
وہ دیکھو دیکھو مرا جاں نثار رقص میں ہے

مدینہ جاؤں میں دیکھوں وہ روضۂ اطہر
ازل سے اب بھی مرا انتظار رقص میں ہے

زباں پہ نام محمدؐ جو آگیا انجم!
مرا یقین مرا اعتبار رقص میں ہے

غزل

ایک اِک پل کا احترام کرو
وقت کہتا ہے کوئی کام کرو

خواہشوں کا نہ ازدحام کرو
خود کو مت نفس کا غلام کرو

لوگ سارے مذاق اُڑائیں گے
بات کوئی نہ بے لگام کرو

وہ جو رزّاق بھی ہے خالق بھی
یاد اُسے صبح اور شام کرو

کون چھوٹا ہے اور کون بڑا
یہ نہ سوچو کبھی سلام کرو

زندگی ایکبار ملتی ہے
جب ملی ہے تو احترام کرو

دشمنی تلخیاں بڑھاتی ہے
دشمنی دوستی سے رام کرو

اپنا غصّہ ہی اپنا دشمن ہے
خود کو مت تیغ بے نیام کرو

میں دیا ہوں غریب کے گھر کا
مجھ کو ہرگز نہ نذرِ بام کرو

وہ منانے پہ آ گئے ہیں اُتر
دل کے بچنے کا اہتمام کرو

کتنا فرسودہ ہو گیا انجم
دُور دنیا سے یہ نظام کرو

ساگر سے بھی گہرا ہوں
پھر بھی تشنہ تشنہ ہوں

اچھّا کھاتا پیتا ہوں
پھر بھی میں ناشکرا ہوں

ہر پل ہر دم کٹتا ہوں
قربانی کا بکرا ہوں

میری تو تعریف نہ کر
میں بھی گورکھ دھندا ہوں

سارے مذاہب مجھ میں ہیں
میں اک سیدھا رستہ ہوں

دیکھ کے تو بھی ڈرتا ہے
تیرا اصلی چہرا ہوں

کیسے دوں "ماں" کی گالی
میں بھی ماں کا بیٹا ہوں

خاموشی پہ طنز نہ کر
جا گونگا ہوں بہرہ ہوں

ہر جھوٹے کا دعویٰ ہے
سچائی کا پتلا ہوں

دیکھ بجا کر مجھکو بھی
سات سُروں میں بجتا ہوں

سچ کہہ کر میں تو انجمؔ
سب سے لیتا بدلہ ہوں

جہاں بھی تری چہچاہٹ ملے گی
وہاں زندگی کی تراوٹ ملے گی

تری سادگی میں حقیقت ہے لیکن
مگر دوسروں میں بناوٹ ملے گی

تجھے یاد کرنا مری بندگی ہے
ترے نام کی ہی یہاں رٹ ملے گی

تری پائلوں میں عجب راگنی ہے
بھلا یہ کہاں جھنجھناہٹ ملے گی

مشینی جہاں میں مشین بن گیا ہوں
تمہیں اور کیا دوں تھکاوٹ ملے گی

یہاں جھٹ پٹ اب آدمی بھی کہاں ہیں
ہر اک چیز میں اب ملاوٹ ملے گی

کہ جی چاہتا ہے ترے پاس آؤں
لبوں کی ترے کپکپاہٹ ملے گی

کسی سے کسی کو محبت نہیں ہے
یہاں مال و زر سے لگاوٹ ملے گی

نظر گر حسیں ہو نظارے حسیں ہیں
جدھر دیکھئے گنگناہٹ ملے گی

اگر مشوروں پر ہی تکیہ کروگے
تمہیں ہر قدم پر رکاوٹ ملے گی

مرے دل میں جھانکو محبت سے انجمؔ
اسی نام کی بس سجاوٹ ملے گی

لفظوں کی ردائوں کو بولیاں ترستی ہیں
بات تجھ سے کرنے کو خوبیاں ترستی ہیں

بانسری کی انوبھوتی شبدوں میں ہے ناممکن
آج بھی تو گوکل کی گوریاں ترستی ہیں

آنسوؤں کے ساگر میں اضطراب کیسا ہے
کھل کے سانس لینے کو سسکیاں ترستی ہیں

فاصلوں کی ٹھوکر سے دل تو بجھ نہیں سکتے
اپنے ہمنشینوں کو یاریاں ترستی ہیں

آج کل کے گلشن بھی جنگلوں سے لگتے ہیں
پھولوں کی رفاقت کو تتلیاں ترستی ہیں

پیٹ بھر کھلانے کو بھوکے بیوی بچوں کو
اک غریب کے گھر میں ہانڈیاں ترستی ہیں

مائیں گنگناتی ہیں گیت فلم کے انجم
ہونٹوں پر مچلنے کو لوریاں ترستی ہیں

چارہ گر روٹھ کر نہ جائے کہیں
درد پھر سے اُبھر نہ جائے کہیں

دید کی دے دوا ذرا اُس کو
تیرا بیمار مر نہ جائے کہیں

ساری مٹی پلید کر دے گا
آدمی چاند پر نہ جائے کہیں

ٹھہرے پانی کو چھیڑتے کیوں ہو
صاف چہرہ بکھر نہ جائے کہیں

آدمی رنج و غم سے گھبرا کر
موت سے پہلے مر نہ جائے کہیں

سوچنے میں تجھے سمجھنے میں
عمر ساری گزر نہ جائے کہیں

تجھ سے کم اس لئے میں ملتا ہوں
دل مرا تجھ سے بھر نہ جائے کہیں

جب بھی صحرا ہرا بھرا دیکھے
دل میں اک مور ناچتا دیکھے

جب سے آنکھوں کا میکدہ دیکھے
اپنا ہر شعر جھومتا دیکھے

ایک جمبل ہے یہ جہاں سارا
جس کو دیکھے لٹا لٹا دیکھے

کتنا بے فکر کر دیا ہے ہمیں
چار تنکوں کا آسرا دیکھے

روز و شب ہم یہاں سیاست میں
کھیل اک سانٹھ گانٹھ کا دیکھے

زخمی زخمی لہو لہو انساں
آج میلے میں جا بجا دیکھے

دل ہمارا بھی اک پرندہ ہے
اس کو اُڑتا ہوا سدا دیکھے

درسِ صنّاعی دے رہا ہے ہمیں
ایک چڑیا کا گھونسلہ دیکھے

جس کو کہتے ہیں سب حفیظ انجم
ایک انسان بے ریا دیکھے

رات بھر ہم جو گیلے گیلے تھے
خار الفاظ کے نوکیلے تھے

ہر قدم پر کھڑے جھمیلے تھے
دیکھکر ہاتھ پاؤں پیلے تھے

وار جس نے کیا کھلا ہی کیا
شہر میں ہم نئے نویلے تھے

موت پر پُرسہ دینے والے بھی
کتنے خوش باش تھے سجیلے تھے

چاند پر کیا ملا تمہیں جاکر
زندگی کے یہاں وسیلے تھے

لب کی دہلیز پر سجایا ہوں
بول اُن کے بہت رسیلے تھے

بھید دل پر لئے ہوئے انجم
بانسری کی طرح سُریلے تھے

کوئی سپنا سلونا بہہ رہا ہے
تری آنکھوں کا کجرا بہہ رہا ہے
کھلی آنکھوں سے تکتا جا رہا ہوں
مرا سارا اثاثہ بہہ رہا ہے

سمندر میں ملے تو چین آئے
مرے اندر بھی دریا بہہ رہا ہے

تمہیں تیراک بننا ہی پڑے گا
نہ دیکھو اور کیا کیا بہہ رہا ہے

یہاں کیا سوچ کر میں آگیا تھا
یہاں الٹا ہی دریا بہہ رہا ہے

بچالے جان اس کی بھی بچالے
کوئی زخمی پرندہ بہہ رہا ہے

سبھی موجِ ہوس میں جی رہے ہیں
یہاں رشوت کا پیسہ بہہ رہا ہے

نیا سورج اُگے گا دیکھ لینا
غریبوں کا پسینہ بہہ رہا ہے

چٹانوں کا وہاں پر ذکر ہی کیا
جہاں انجم ہمالہ بہہ رہا ہے

یہ زمانہ تجھے غدر نہ لگا
یہ سمجھنے میں عمر بھر نہ لگا

زندگی کی کتاب گو ہے ضخیم
اس کو پڑھنے میں عمر بھر نہ لگا

اعتبار اُٹھ چکا ہے دُنیا کا
کوئی دنیا میں معتبر نہ لگا

دائرہ زندگی کا چھوٹا ہے
گھر میں انبارِ مال و زر نہ لگا

ساتھ اندھیروں میں چھوڑ دیتا ہے
میرا سایہ بھی ہمسفر نہ لگا

دوستو آپ سے ہے خوف مجھے
دشمنوں سے تو مجھ کو ڈر نہ لگا

دل میں کوئی بسا ہوا ہے مرے
دل کو میرے تو یوں نظر نہ لگا

یہ تو جنگل ہے آدمیوں کا
جسم پر کوئی مجھ کو سر نہ لگا

آپ ہوتے نہیں ہیں جب انجم
میرا گھر مجھ کو میرا گھر نہ لگا

اے دوست، دوستوں کی گذارش میں آگیا
شہرِ انا کی میں بھی نمائش میں آگیا

کس طرح دیکھ میں بھی نوازش میں آگیا
وہ ننگے پاؤں بھیگتا بارش میں آگیا

چہروں کی ہے یہ بھیڑ کہ رنگوں کی ہے پھوار
لگتا ہے ایسا جیسے نمائش میں آگیا

ہنس ہنس کے کہہ رہی ہے یہی زیست بار بار
کیوں مصلحت پسند کی سازش میں آگیا

ہمدردیوں کا جال بہت ہی حسین تھا
خودداریوں کو چھوڑ کے بندش میں آگیا

کشکول بھر گیا ہے نوازش سے کس طرح!
سچ سچ بتا تو کس کی پرستش میں آگیا

انجم مری اڑان بھی محدود ہو گئی
یہ کیا ہوا کہ میں بھی ستائش میں آگیا

کوئی پرندہ آج لجائے بیٹھا ہے
چونچ پروں میں اپنی چھپائے بیٹھا ہے
راہ کٹھن تاریک سفر ہے اس پر بھی
کیوں مٹھی میں چاند چھپائے بیٹھا ہے

کون سُنے گا کوہِ ندا کے اب قصّے
کیوں خالی انبار لگائے بیٹھا ہے
آیا ہے مدھ ماتا ساون کیا کیجے
رمتا جوگی دھوم مچائے بیٹھا ہے

گھر تیرے اب کوئی نہیں آنے والا
کیوں راہوں میں پھول بچھائے بیٹھا ہے
ہر مشکل کا حل ہوتا ہے کھوج ذرا
کیوں چرنوں میں سر کو جھکائے بیٹھا ہے

لوٹ کی دولت ہاتھ تو آئی ہے لیکن
وہ اپنا سکھ چین گنوائے بیٹھا ہے
سارے بندھن ٹوٹ چکے جب چاہت کے
انجم پھر کیوں آس لگائے بیٹھا ہے

کہاں ہیں جو تجھے سر بہ سر آئینے
مرے دور کے باہنر آئینے

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
ہیں اتنے لگے میرے گھر آئینے

اُنہیں ڈھونڈتا ہی رہا عمر بھر
کہاں کھو گئے ہمسفر آئینے

وہ آئے نہیں پر خیال آگیا
یہ کس نے جڑے بام و در آئینے

خموشی کا مطلب تو کچھ اور تھا
نہیں تھے کبھی بے خبر آئینے

نہیں سادگی کا ہے نعم البدل
بتاتے رہے عمر بھر آئینے

تھے اِن کی حفاظت پہ معمور تم
ہوئے کِس طرح دربدر آئینے

چُبھوتا ہے کیوں کرچیاں تن بدن
کھُلی چھت سے جھانکا نہ کر آئینے

نیا ہے زمانہ یہ انجم سُنو
خریدو ذرا دیکھ کر آئینے

میرے آنگن میں چاندنی اُترے
لے کے خوشیوں کی پالکی اُترے

کھڑکیاں کھول دیجئے ساری
دل کے کمرے میں روشنی اُترے

ذہن گندے ہیں آج لوگوں کے
کیسے چہروں پہ دلکشی اُترے

لوگ مر مر کے جی رہے ہیں یہاں
کاش اِن پر بھی زندگی اُترے

پنکھ کافی نہیں اُڑانوں کو
ان پہ اُڑنے کی آگہی اُترے

میری کٹیا محل لگتی ہے مجھے
جب بھی خوابوں میں وہ پری اُترے

پھر کوئی زخم دیجئے تازہ
لب پہ انجمؔ مرے ہنسی اُترے

دوست کی دشمنی سی لگتی ہے
پھانس دل میں چبھی سی لگتی ہے

تیری چاہت میں تیری باتوں میں
کتنی آلودگی سی لگتی ہے

اژدہا تیرگی کو نگلے گا
بس ابھی لو پھٹی سی لگتی ہے

ہر طرف چھل کپٹ کے سائے ہیں
یہ ہوا موسمی سی لگتی ہے

آج سچ بھی بُرا سا لگتا ہے
جھوٹ میں نغمگی سی لگتی ہے

کرب چھپتا نہیں چھپانے سے
یہ ہنسی کھوکھلی سی لگتی ہے

مُسکرا دیجئے خدارا تم
ہر طرف تیرگی سی لگتی ہے

زیست انجمؔ بغیر ہل چل کے
اک اپاہج گھڑی سی لگتی ہے

میں صبح مر گیا تو کبھی شام مر گیا
میں جی رہا ہوں اور مرا نام مر گیا

چھوٹی حماقتوں کا زمانہ نہیں رہا
اچھا ہوا کہ سر سے یہ الزام مر گیا

اُس کی ادھوری ذات مکمل نہ ہو سکی
جو کوئی اس جہان میں بے نام مر گیا

محفل میں چاپلوسی کی اک بھیڑ دیکھ کر
میری زباں پہ آیا جو پیغام مر گیا

کچھ سوچنے سمجھنے کی فرصت ملی نہیں
اچھا ہوا کہ جیت کا کہرام مر گیا

یہ کس کی ڈائری ہے کہ لکھا ہے بس یہی
سورج مری وفا کا لبِ بام مر گیا

محنت کا دور ہے یہ مشقت کا دور ہے
انجمؔ مشینی دور میں آرام مر گیا

جب کبھی تیرگی سے اُگ آ ئی
ہر بچھڑی سنسنی سے اُگ آ ئی

ہر طرف ہے وہی سراب نظر!!
ہر طرف تشنگی سے اُگ آ ئی

جوں ہی برسات کی پھوار پڑی
چار سُو زندگی سے اُگ آ ئی

تیرے آنے کا تھا جو وہم وگماں
دل میں پھر دلکشی سے اُگ آ ئی

دور اُفق پر گلاب کھلتے ہیں
ذہن میں تازگی سے اُگ آ ئی

کیوں شکن پر شکن ہے ماتھے پر
کس لئے برہمی سے اُگ آ ئی

وقت اب دسترس میں ہے انجم
پھر سے سنجیدگی سے اُگ آ ئی

سوالوں کی طرح الجھے تو دیکھوں
گلابوں کی طرح مہکے تو دیکھوں

جھلستی دھوپ رخصت ہو چکی ہے
سسکتی شام کے میلے تو دیکھوں

شناسا ایک بھی چہرہ نہیں ہے!!
گھروں پر ہیں لگے کتبے تو دیکھوں

یقیناً یہ کوئی سرکس ہی ہوگا!!
اُچھلتے کودتے بونے تو دیکھوں

بڑے اچھے بھی ہوں گے قیمتی بھی!!
خریدے آپ کے تمغے تو دیکھوں

کسی بھی وقت یہ جنگل بنیں گے
تمہاری جھوٹ کے پودے تو دیکھوں

ہیں وحشت ناک کیوں اتنی صدائیں
یہ بجتے ڈھول اور تاشے تو دیکھوں

مرا البم پرانا طاق میں ہے
تمہاری یاد گر گونجے تو دیکھوں

پہیلی کی طرح ہے زندگی بھی!!
کوئی انجم اسے بوجھے تو دیکھوں

دنیا میں دن گزارنا آسان مت کہو!
صحرائے زندگی کو گلستان مت کہو!

مُردہ ضمیر ہے تو خودی پائمال ہے
تم ایسے خود سروں کو تو انسان مت کہو

اخلاص کی قبائیں سبھی چاک ہو گئیں!!
پھر بھی جہاں میں اس کا ہے فقدان مت کہو

اک آدمی کی ایسی بھی تعریف ہے غلط
اُس کو بڑھا چڑھا کے تو بھگوان مت کہو

پہچان اپنے آپ کی جب تک نہ ہو سکے
لوگوں کے ملنے جلنے کو پہچان مت کہو

ہے آسماں زمیں پہ لانے کی کوششیں
تم ایسی کوششوں کو تو ارمان مت کہو

اس توڑ پھوڑ اور تشدد کی آگ کو
انجمؔ نئے سماج کا نرمان مت کہو

آوارہ دل کی برسوں سے انگنائیوں میں تھا
چہرہ مری تلاش کی پرچھائیوں میں تھا

کیوں اپنے خیر خواہوں سے دیکھا نہیں گیا
کل تک بہم خلوص جو ہم بھائیوں میں تھا

لفظوں کے پیرہن سے سجاتا رہا اُنہیں
اک لطفِ بیکراں کبھی تنہائیوں میں تھا

شہروں میں سانس لینا بھی دوبھر ہے دوستو
اک کیف میرے گاؤں کی پُروائیوں میں تھا

کانوں کو بھا رہی تھی صدائے جرس تری
تو گیت بن کے گونجتی شہنائیوں میں تھا

جس کو سمجھ رہے تھے سبھی اپنا ناخُدا
وہ شخص اپنی قوم کے سودائیوں میں تھا

انجمن میں جس کسی کو بھی اپنا سمجھ لیا!
وہ پیش پیش میری ہی رُسوائیوں میں تھا

یادوں کے رنگ منچ پہ جلوے تھرک گئے
دیوار و در خوشی سے ہمارے مہک گئے

ہم کو بحر سراب نظر کچھ نہ مل سکا!
ہم پھاند کر جو وقت کی دیوار تک گئے

گاؤں میں باڑھ آئی تھی فصلیں ہوئیں تباہ
شہروں میں تاجروں کے مقدر چمک گئے

تم نے سمجھ لیا تھا جنھیں میر کارواں
مشکل سے دو قدم نہ چلے تھے کہ تھک گئے

مرہم کا کام کر گئی منزل کی جستجو!!
چھالے ہمارے پاؤں کے جب جب بھی پک گئے

لے کر تبسموں کے خزانوں کو دوستو!
دشمن بھی گھر بلائے تو ہم بے جھجک گئے

کیوں آپ کے ہی کان پہ جوں رینگتی نہیں
سن کر صدائے وقت تو پتھر تڑک گئے

آزاد مملکت کے یہ شایان شان نہیں
اردو کا نام لیتے ہی شعلے بھڑک گئے

واعظ یہ میکدہ وہ ترا میکدہ نہیں!!
انجم غم حیات کو پی پی کے چھک گئے

پھر وہ چاہت کا نیا ڈھونگ رچانا چاہے
میری آواز میں آواز ملانا چاہے

کوئی مغرور ہے کیوں ہاتھ ملانا چاہے
رابطہ اُس سے بھلا کون بڑھانا چاہے

میں جرس بن کے فضاؤں میں بکھر جاؤں گا
میری آواز اگر کوئی دبانا چاہے

اک نظر بہرِ خدا بہرِ کرم بہرِ عطا!!!
تو جسے چاہے اُسے سارا زمانا چاہے

میری فطرت ہے کہ میں دل کی سنا کرتا ہوں
اس کی کوشش ہے کہ انگلی پہ نچانا چاہے

انگلیاں اُس کی جھلس جائیں گی سچ کہتا ہوں
جو بھی گلشن میں مرے آگ لگانا چاہے

جھوٹ کی عمر بہت کم ہے پتا ہے اُس کو
پھر بھی سچائی سے دامن وہ بچانا چاہے

تو شگفتہ ہی سہی پھول ہے مسلاؔ انجم
کیسے کالر میں کوئی اس کو لگانا چاہے

جب بھی پڑھتا ہوں ترا شعر نیا لگتا ہے
اس میں دکھ درد زمانے کا چھپا لگتا ہے

دیکھنے میں جو بڑا ہوش رُبا لگتا ہے
لیکن آواز سے وہ ٹوٹا ہوا لگتا ہے

آج ماحول تجھے خوفزدہ لگتا ہے
تو ابھی نیند سے بیدار ہوا لگتا ہے

میرے احساس پہ جو چھایا ہوا لگتا ہے
وہ تو عادت کا بُرا دل کا بھلا لگتا ہے

عُمر بھر بھول بھلیّوں میں گھرا لگتا ہے
تو حقیقت سے سدا دور رہا لگتا ہے

جانے کیوں تجھ کو مرے یار روا لگتا ہے
اس کہانی کا مجھے انت بُرا لگتا ہے

ایک سازش ہے یہ الزام نیا لگتا ہے
تیرے اپنوں سے یہ انعام ملا لگتا ہے

جھوٹ سننے کا ہر اک عادی ہوا لگتا ہے
سچ کہو گے تو مرے بھائی بُرا لگتا ہے

تیری بات اور ہے تو پیڑ گھنا لگتا ہے
تپتے صحرا میں بھی انجمؔ تو ہرا لگتا ہے

میں نے یادوں کی انگیٹھی کو جلایا بھی نہیں
کوئی پل اس کو بھلادوں یہ گوارا بھی نہیں

ہیں خرافات میں احباب کی جاتا بھی نہیں
اپنی من مانی کیئے جاؤ اچنبھا بھی نہیں

خود کو مجرم وہ سمجھتا ہے مجھے حیرت ہے
اس پہ الزام ابھی میں نے تراشا بھی نہیں

کیوں مرے خون کا پیاسا تو نظر آتا ہے
سچ بتا تیرا مرا خون کا رشتہ بھی نہیں

غیر معروف ہوں میں شہر انا میں صاحب
اپنی تشہیر کا اب کوئی ارادہ بھی نہیں

اس کے آنگن میں کہاں پھول سے بچے ہوں گے
جس کے آنگن میں کسی پھول کا پودا بھی نہیں

قوم اپنی ہیں بتاؤں یہ ضروری کیا ہے
کیا تمہیں اپنا پرایا نظر آتا بھی نہیں

خود کو اردو کا بہی خواہ بتانے والو!!!
آپ کے گھر میں تو اردو کا رسالا بھی نہیں

کتنی معصوم خموشی ہے برتتی انجم
دل مرا ٹوٹ گیا اور چھناکا بھی نہیں

کون آخر یہ اداکار مرے سامنے ہے
بن کے جو میرا پرستار مرے سامنے ہے

اک نیا مصر کا بازار مرے سامنے ہے
ہر کوئی بکنے کو تیار مرے سامنے ہے

جانے کس وقت زمیں بوس یہ ہو جائے گی
ٹوٹی تہذیب کی دیوار مرے سامنے ہے

کاٹتے کاٹتے خود کٹ کے گری ہے شاید
ایک ٹوٹی ہوئی تلوار مرے سامنے ہے

بنتے بنتے بھی کبھی کھیل بگڑ جاتے ہیں
ایسی تمثیل مرے یار مرے سامنے ہے

یہ کسی وقت تباہی بھی مچا سکتا ہے
یہ جو ایٹم کا اوشکار مرے سامنے ہے

میرے بچے بھی پڑھے لکھے ہیں قابل بھی ہیں
میری محنت کا پُرسکار مرے سامنے ہے

صرف لفظوں کا مداری ہے یہ بازیگر ہے
آج کے دور کا فنکار مرے سامنے ہے

خشک ہونٹوں کی مرے پیاس بجھانے انجم
اجنبی شخص کی گفتار مرے سامنے ہے

میں کر رہا ہوں پیار کسی نے نہیں کیا
دشمن سے یوں دُلار کسی نے نہیں کیا

دھونی رمائے بیٹھا ہے پیپل تلے کوئی
یوں میرا انتظار کسی نے نہیں کیا

اک بار جھوٹ کہنے کی اتنی ملی سزا
پھر میرا اعتبار کسی نے نہیں کیا

اب روح کانپتی ہے ترے نام سے اے دوست
اس طرح مجھ پہ وار کسی نے نہیں کیا

رنگین تتلیاں ہیں کہ پھولوں کی پتیاں
ایسا حسیں سنگھار کسی نے نہیں کیا

کنگاروؤں کو دیکھ کے کہنا پڑا لسٹ مجھے
بچوں سے ایسا پیار کسی نے نہیں کیا

نفرت کے کاروبار میں انجمؔ تھے سب جُٹے
الفت کا کاروبار کسی نے نہیں کیا

بے کسی بے بسی بے کلی اور میں
تیرگی تشنگی زندگی اور میں
کس طرح فرش پر میں بٹھاؤں انہیں
اُف قیامت کی وہ نازکی اور میں

اپنی اپنی سنانے پہ بے چین سے تھے
بیکراں رات کی سنسنی اور میں

جان پہچان ہے بس تعارف نہیں
پھر بھی پیوست ہیں زندگی اور میں

میں بھی تنہا کہاں ہوں مرے ہم نفس
چند سانسیں، تری بے رخی اور میں

اک نیا مدعا اک نیا مدعی
بے نوا دشت کی منصفی اور میں

اشتہاری زباں کس طرح ہو بیاں
میرے لفظوں کی بے مائیگی اور میں

اپنے دلبر سے ملتا ہے انچک گلے
ایک ندیا ہے رمتی ہوئی اور میں

نغمہ ہے ایک گیت ہے سرگم ہے زندگی
یہہ کس نے کہہ دیا کہ تمہیں غم ہے زندگی

پت جھڑ میں پات پات بکھرتی دکھائی دے
ساون میں دیکھیئے تو بڑی نم ہے زندگی

خاموشیوں کا دشت اگر موت ہے تو پھر!!
اک شور ہے شرابہ ہے اُدھم ہے زندگی

جس آدمی کے ذہن میں حزن و ملال ہے
اُس آدمی کے حق میں تو ماتم ہے زندگی

اک بار اس کو پیار سے چھو کر تو دیکھیئے!
نازک بدن ہے نرم ہے ریشم ہے زندگی

ہے اپنے اختیار میں جو کچھ بھی مان لیں!!!
امرت ہے یہ کبھی تو کبھی سم ہے زندگی

کر استعمال اپنے ہر اک لمحہ کا صحیح!!
کرنے بہت ہیں کام بڑی کم ہے زندگی

محنت بغیر جینا جہاں میں محال ہے
بہتر ہے جان لے کے بشر شرم ہے زندگی

ہر شخص چاہتا ہے جیوں اور بھی جیوں
اتنی جناب پیاری ہے جانم ہے زندگی

یہ مانگتی ہے اگنی پرکشا بھی موں کبھی
سیتا ہے یہ کبھی، کبھی مریم ہے زندگی

اک بار آنکھ موند کے دیکھو تو تم سبھی
کتنی حسین یادوں کا البم ہے زندگی

موت و حیات پر تو اجارہ نہیں مگر
انجم یہ دیکھنا ہے کہاں ضم ہے زندگی

ڈھٹائی سے برابر بولتے ہیں
وہ ہر پتھر کو گوہر بولتے ہیں

تمہاری خاکساری ہے دکھاوا
لب و لہجہ یہ تیور بولتے ہیں

یہاں چھت سے بھی سورج جھانکتا ہے
یہاں برسات میں گھر بولتے ہیں

جسے تم سیج کہتے ہو گلوں کی
اسے کانٹوں کا بستر بولتے ہیں

اٹھاتے ہیں اگر سر اہل باطل!
ابابیلوں کے لشکر بولتے ہیں

نہ آئے گا کوئی سوغات لیکر!
منڈیروں پر کبوتر بولتے ہیں

میری ہمت نہیں ٹوٹی ابھی تک
مرے ٹوٹے ہوئے پر بولتے ہیں

یہاں حسب ضرورت شرکو انجم
خموشی کا سمندر بولتے ہیں

ہم ایک درد کا دریا جو پاٹنے نکلے
خطار باندھے وہاں پر بھی حادثے نکلے

تو جانتا ہے مجھے میں تو حق بجانب ہوں
مرے خلاف مگر تیرے فیصلے نکلے

وہ آج چہرے پہ غازہ لگا کے آیا ہے
تمام گاؤں کے بچے یہ دیکھنے نکلے

ذرا سی گرمی بھی برداشت کر نہیں سکتے
تمہارے شہر کے سب لوگ موم کے نکلے

میں اپنے آپ کو پہچان تک نہیں پایا!
جدید دور کے یہ کیسے آئینے نکلے

ہمارے شہر میں جب سے مشاعرہ ہے ہوا
ہمارے بچے بھی کچھ لفظ بولنے نکلے

جو گندگی تھی اُسے ساتھ لے گیا پانی
"ندی اُترتے ہی پتھر دُھلے دُھلے نکلے"

ہمارا وقت بُرا ہے اسی لئے انجم
جو بے زباں بھی ہمیں آج بولنے نکلے

میں دریا کی روانی لکھ رہا ہوں
کچھ اشکوں کی زبانی لکھ رہا ہوں

تری یادوں کا مسکن ہے اسی میں
میں دل کو راجدھانی لکھ رہا ہوں

سروں کا دیکھکر سیلاب اتنا
تری جادو بیانی لکھ رہا ہوں

میں تیرا حُسن آنکھوں میں بسا کر
میں پھولوں کی جوانی لکھ رہا ہوں

تری فرقت سے میں ہو کر مُعطّر!
محبت جاودانی لکھ رہا ہوں

بشارت جس میں ہو ہر اک بشر کی
میں اک ایسی کہانی لکھ رہا ہوں

مرا چولہ بسنتی ہو گیا ہے
ترا آنچل دہانی لکھ رہا ہوں

کوئی بھنورا چھپا ہے میرے اندر
گلوں سے چھیڑ خوانی لکھ رہا ہوں

کتابوں میں جو ہیں ناپید انجم
میں اُن کی زندگانی لکھ رہا ہوں

پیار میں دوست کوئی جنگ نہ کر
میرا زخمی تو انگ انگ نہ کر

بات کہتا ہوں میں پتے کی تجھے!
دل تو شیشہ ہے اس کو سنگ نہ کر

تو حسیں مینکا ہے مان لیا!!
پر تپسیا کو میری بھنگ نہ کر

ایک چھوٹی سی یہ گذارش ہے
صاف پانی ہوں رنگ زنگ نہ کر

ساتھ رہ کر تو ایک چھت کے تلے
میرے بھائی تو مجھ سے جنگ نہ کر

چھین کر مجھ سے ہر خوشی میری
زندگی مجھکو اتنا تنگ نہ کر

وسعتیں دے خیال کو انجمؔ
تو انہیں اک کٹی پتنگ نہ کر

ہمارا کمرہ مہک رہا تھا
تمہاری یادوں کا سلسلہ تھا

جو کھائی کھودا وہی گرا تھا
یہی تو قدرت کا فیصلہ تھا

کسی کی آنکھیں نہ دیکھ پائیں
قدم قدم پر جو کربلا تھا

وہ زلف بکھرائے آ رہے تھے
پھر آج موسم بہک رہا تھا

تھے سب کے ہاتھوں میں یوں تو پتھر
پتہ نہیں کیوں وہ ہنس رہا تھا

خزاں کے ہاتھوں وہ لٹ چکا ہے
جو پیڑ کل تک ہرا بھرا تھا

کشادہ پیشانیوں سے پوچھو
کہاں کہاں پر یہ سر جھکا تھا

تمہارے حصّے میں عمر آئی
ہمارے حصّہ میں تجربہ تھا

کوئی بھنور میں بھی خوش تھا انجم
کوئی کناروں پہ ڈوبتا تھا

میں جس کو چاہتا ہوں وہ چہرا دکھائی دے
اس بھیڑ میں بھی کوئی تو اپنا دکھائی دے

چہروں کو دیکھنے کی تمنا نہیں رہی
چہروں سے بھی حسین مکھوٹا دکھائی دے

یہ آرزو ہماری بھی دم توڑنے لگی!!!
کوئی تو قول و فعل میں پکا دکھائی دے

نزدیک جا کے اور بھی خطرہ نہ مول لیں
وہ دور سے ہی آگ بگولہ دکھائی دے

کتنی عجیب بات ہے دور جدید کی
ہر شخص اپنے آپ میں لڑتا دکھائی دے

آنکھوں میں رچ گیا ہے مری جب سے جانِ جاں
جس سمت دیکھتا ہوں سنہرا دکھائی دے

تیرے بدن کی آنچ کی تاثیر کیا کہوں
"جو رنگ تو پہن لے وہ گہرا دکھائی دے"

انجم وہ کس رہے ہیں نئی ہم پہ پھبتیاں
چونٹی بھی آج ایک ہمالہ دکھائی دے

تم اپنے شعر میں کچھ ایسا ذائقہ رکھنا
اک ایک لفظ بہت ہی نپا تلا رکھنا

رہِ حیات میں اچھوں سے رابطہ رکھنا
بُرے سے اور بُرائی سے فاصلہ رکھنا

نشاط و غم کا تو تانتا لگا ہی رہتا ہے
پر اپنے آپ میں جینے کا حوصلہ رکھنا

نفاق یونہی عادت ہے اُس کی فطرت بھی
یہ ایک روگ ہے روگی سے فاصلہ رکھنا

تمام لوگ یقیناً بُرا سمجھتے ہیں
نہ اپنے گھر میں کبھی ٹوٹا آئینہ رکھنا

نئے سماج میں اس کی بہت ضرورت ہے
یہ شہر شہرِ انا ہے لیا دیا رکھنا

ہماری زیست ہی کیا عاقبت سنور جائے
"ہر ایک موڑ پہ قرآں کو رہنما رکھنا"

دلوں کا حال وہی جانتا ہے بس انجم
ہمارا کام یہی ہے کہ خوشنما رکھنا

اس قدر جھوٹ سے تو کام نہ لے
ہر جگہ دیکھ میرا نام نہ لے

دن میں ہشاش میں بھی رہتا ہوں
صبح لے لے تو میری شام نہ لے

کس لئے بھیگتا ہے بارش میں
مفت کا دیکھ پھر زکام نہ لے

کیسے آئے گا قلب قابو میں
تو اگر ہاتھ میں لگام نہ لے

سوکھ جائے گا آنکھ کا دریا
رونے دھونے سے دیکھ کام نہ لے

اس سے بہتر ہے بھوک سے مرجا
ایک لقمہ بھی تو حرام نہ لے

ہر گھڑی جھوٹ موٹ گھڑنے میں
کم سے کم رام کا تو نام نہ لے

ہے بڑا پن معاف کرنے میں
اُس سے انجم تو انتقام نہ لے

اُنکی آنکھوں سے مئے برستی ہے
ہر طرف اب فضاء میں مستی ہے
ایک مکڑی بڑی حسین و گداز
جال میں مجھکو اپنے کستی ہے
جو بلندی ہے آج دنیا کی !!!
وہ ہماری نظر میں پستی ہے
ایک ڈائن ہے میری تنہائی
رات بھر دیکھ مجھکو ڈستی ہے
اب کروڑوں میں ہے وہ کوڑی مل
آج بھی ہم پہ تنگ دستی ہے
اس حقیقت سے متفق ہیں سبھی
زندگی موت سے بھی سستی ہے
لوگ موقع پرست ہیں انجم
آج ہر دل میں خود پرستی ہے

خموشیوں سے میں ڈر گیا تھا
اُداسیوں میں اُتر گیا تھا

جہاں جہاں میں بکھر گیا تھا
وہاں وہاں وہ سنور گیا تھا

اُسی کے حق میں تھی کامیابی
جو میرا لیکر ہُنر گیا تھا

وہ اُٹھ کے پہلو سے جا رہے تھے
سمئے کا پنچھی ٹھہر گیا تھا

حسین تھا کچھ گداز بھی کچھ
وہ ایک پل جو گزر گیا تھا

اُسے بھی دنیا حسیں لگی ہے
جو میری لیکر نظر گیا تھا

جواب اُس سے نہ بن پڑا تو
سوال بن کر اُبھر گیا تھا

دیوار و در بھی نہ جان پائے
تھکا تھکا جب میں گھر گیا تھا

اُسی کو سچا کہیں گے انجم
جو لے کے جھوٹی خبر گیا تھا

یہ پھول نمائش کے ہیں مہکا نہیں کرتے
ان پھولوں پہ بھنورے کبھی ڈولا نہیں کرتے

احباب جنہیں خود پہ بھروسہ نہیں ہوتا
دنیا میں کسی پر وہ بھروسہ نہیں کرتے

پت جھڑ کے جو موسم سے سبق سیکھ چکے ہوں
وہ موسمِ گل آنے پہ بہکا نہیں کرتے

ہم ضبط سے پی جاتے ہیں دکھ دردِ جہاں کا
ہم غم کا کسی طرح تماشہ نہیں کرتے

دو چار قدم چل کے جو تھک جاتے ہیں راہی
وہ گیسوئے ہستی کو سنوارا نہیں کرتے

انساں ہیں وہی لوگ حقیقت میں جہاں میں
جو لوگ یہاں خون خرابہ نہیں کرتے

کچھ کر کے دکھانے کی لگن ہوتی ہے جن میں
وہ وقت کو بیکار گنوایا نہیں کرتے

محنت کی کمائی پہ جنہیں ناز ہوا انجم
اوروں کا نوالہ کبھی چھینا نہیں کرتے

جب بزمِ ناز میں وہ وفا ساتھ لے گیا
کشکول آنسوؤں سے بھرا ساتھ لے گیا

چہرہ بجھا بجھا سا تھا آنکھوں میں تھی نمی
زخموں سے چور چور ادا ساتھ لے گیا

وہ مانگتا رہا میں اُسے نا نہ کہہ سکا
اک شخص آج میری انا ساتھ لے گیا

سرگوشیوں کو سُننے کی عادت سی ہو گئی
میں بھی سماعتوں کی قبا ساتھ لے گیا

جب بھی جلوس نکلا دکانیں ہیں لٹ گئیں
ہر شخص جو بھی ہاتھ لگا ساتھ لے گیا

ہر سمت تیرگی کے کھڑے کوہسار تھے
میں بھی ترے کرم کی ضیاء ساتھ لے گیا

جب مجھ سے دوستی تھی محبت خلوص تھا
کیوں میرے دشمنوں کا پتہ ساتھ لے گیا

مقتل بنا ہوا تھا ہر اک شہر گاؤں گاؤں
انجمؔ میں بزرگوں کی دعا ساتھ لے گیا

ہمارے سر پہ برسنے کو جب اُٹھا پتھر
ہمارا درد شناس بن کے رک گیا پتھر

ہے سُرخ، سبز، سنہرا سفید اور سیاہ
میں بام و در میں سجایا ہوں خوشنما پتھر

میں جان بوجھ کے کیوں اس کے منہ لگوں آخر
میں جانتا ہوں اُسے ہے وہ سر پھرا پتھر

میں اپنے قتل کی اُس کو سزا نہ دے پایا
جو میرے ہاتھ میں آیا پگھل گیا پتھر

نہ دیکھئے کہ لگے مجھے اس طرح حقارت سے
تمہارے گھر کا نہیں ہوں گرا پڑا پتھر

ہمیشہ درد ہی دیتا ہے زخم دیتا ہے
کبھی کبھی تو بنا درد کی دوا پتھر!

کئی دنوں سے وہ بھوکا تھا اور کیا کرتا
غریب بھوک کی شدت میں کھا گیا پتھر

وفا کے شہر میں کیسی یہ خون کی ہولی
یہ کھوجنا ہے کہ کس نے اُٹھا لیا پتھر

اُسے سنبھال کے رکھا ہوں آج تک انجم
ہماری چھت پہ جو آیا تھا پھول سا پتھر

نکل آؤ کبھی اپنی تہوں سے
رہو گے اور کب تک بے حسوں سے

ہمارے خانقاہِ دل میں آؤ!
تمہیں پہچانتا ہوں پیکروں سے

وہ ہم پر پیار برسانے لگے ہیں
مہک آنے لگی ہے پھر خطوں سے

کلائی چھن گئی گورے بدن کی
ابھی تک خون رِستا ہے نگوں سے

مقالہ ہے بہت ہی یہ پرانا
ہمیشہ فائدہ ہے غافلوں سے

پھٹے کپڑے پہن کر آ گیا ہے
نوازا جا رہا ہے قہقہوں سے

عمارت آسماں چھونے لگی ہے
بنائی جا رہی ہے رشوتوں سے

ہماری ہار انجمؔ کیا بتاؤں
بڑی دلچسپ ہے یہ فاتحوں سے

تیرگی سے خطرہ تھا روشنی سے خطرہ ہے
اُس صدی سے بڑھ کر اب اِس صدی سے خطرہ ہے

سادگی ضروری ہے سادگی کو اپناؤ!!
جھوٹی شان و شوکت کی زندگی سے خطرہ ہے

اب خدا محافظ ہے کھوکھلی عمارت کا!
دُور تک جو پھیلی ہے اس نمی سے خطرہ ہے

سانپ ہے یہ زہریلا نام اس کا کچھ بھی ہو!
آدمی سے دھوکا ہے آدمی سے خطرہ ہے

واقعات کہتے ہیں تجربے بتاتے ہیں!
سازشوں سے دھوکا ہے سازشی سے خطرہ ہے

دائروں میں رہتا ہے دائروں کا ہے قیدی
پُرفریب دانش کی رہبری سے خطرہ ہے

سر جھکا کے ملنے کے دن نہیں رہے اب تو
آپ کی یہ حد درجہ سادگی سے خطرہ ہے

چھن چکی ہے شنوائی گم ہوئی ہے گویائی!
درد کی حفیظ انجم خامشی سے خطرہ ہے

چہرے پر یہ زردی کیوں ہے
اس گرما میں سردی کیوں ہے

غیروں میں ہمدرد ملیں گے
اپنوں میں بے دردی کیوں ہے

میں تو ہوں مٹی کا پتلا!!
آگ انا کی بھردی کیوں ہے

ڈرتے مرتے کیوں جیتے ہو
آخر یہ نامردی کیوں ہے

رکشک بھکشک بن بیٹھے ہیں
جسموں پر یہ وردی کیوں ہے

یاد اسی کی ہر پل ہر دم
آخر یہ سر دردی کیوں ہے

سادھو سنت ولی کے آنگن
انجم دہشت گردی کیوں ہے

اک لفظ آج ایسا معمے میں آگیا
پڑھ کر تمہارا نام مِن سکتے میں آگیا

کل تک اسیرِ ذات تھا گمنام تھا بہت
دنیا کے آج کھیل تماشے میں آگیا

غربت گئی تو اتنا ہی بس فائدہ ہُوا
مکر و فریب اور بھی لہجے میں آگیا

شُدھ بُدھ پڑھا لکھا تھا مگر ہوشیار تھا
ذرّہ تھا آفتاب کے رُتبے میں آگیا

پھیلا تو آسمان ہوں میں کائنات ہوں
سمٹا تو ایک بوند میں قطرے میں آگیا

سبزا اُگا ہے پیڑ اُگے کونپلیں اُگیں
جنگل سمٹ کے چھوٹے سے گمرے میں آگیا

اب آسمان چھونے چلا ہے یہ دیکھئے
انجمؔ بلا کا جوش پرندے میں آگیا

راس آئی نہ دوستی قبلہ
خوب اجرت ہمیں ملی قبلہ

چھوڑ دیجیے جلی کٹی قبلہ
بات سمجھیے بنی تُلی قبلہ

دوستی یہ پنپ نہیں سکتی!
مور کی اور سانپ کی قبلہ

دھیرے دھیرے وجود کھودیگی
یہ ہے باتوں کی ساحری قبلہ

پیٹھ پیچھے بُرا بھلا کہنا!
ہے یہ عادت بہت بُری قبلہ

حرکتیں لومڑی کی کرتے ہیں
کھال پہنے ہیں شیر کی قبلہ

اوچھی باتوں سے جھوٹی باتوں سے
اور پھیلے گی بدظنی قبلہ

مجھ میں پنہاں کئی سمندر ہیں
بن کے مِل جاؤ تم ندی قبلہ

ایسا کیا ہم نے کہدیا انجمؔ!
کیوں ہے رنگت اڑی اڑی قبلہ

○

آپ کی جب تک ذرا بھی جستجو ہوتی نہیں
زندگی تب تک یقیناً سُرخ رو ہوتی نہیں

در بدر کیوں پھر رہے ہو سوچ کہ اپنی اصلیت
خواہشِ دل اس طرح تو سُرخ رو ہوتی نہیں

کیسا یہ انصاف ہے میں پوچھتا ہوں آپ سے
کیا غریبوں کی جہاں میں آبرو ہوتی نہیں

کچھ کھنچے رہتے ہیں وہ بھی، کچھ کھنچے رہتے ہیں ہم
روز و شب مِلتے ہیں لیکن گفتگو ہوتی نہیں

یہ خیالوں کا رچاؤ کس طرح مِل پائے گا
تیری میری شکل بھی جب ہو بہو ہوتی نہیں

ہم جدا تو ہو گئے ہیں سِسکیوں کے درمیاں
کیوں مِلن کی بات کوئی روبرو ہوتی نہیں

ریت کے ٹیلے کو ہم نے ریت کا ٹیلہ کہا!
اس لئے شہرت ہماری چار سو ہوتی نہیں

نیک نامی کی یہ چادر پھٹ گئی جو ایک بار
اتنی آسانی سے انجمؔ یہ رفو ہوتی نہیں

○

یہ کون ہے چھپا ہوا پیچھے کواڑ کے
دشمن اگر ہے سامنے آئے دہاڑ کے

گیدڑ کی طرح چھپ جو گیا چھیڑ چھاڑ کے
رکھ دے نہ کوئی شیر صفت چیر پھاڑ کے

کچھ اور بڑھ گئی ہے ہوس واہ واہ کی
رکھے لگا ہے ساتھ میں ٹٹو بھی بھاڑ کے

آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی!
رکھا ہے وقت نے تری صورت بگاڑ کے

اِس سے بڑا مذاق بھلا ہوگا اور کیا؟
چیونٹی پڑی ہے دیکھئے پیچھے پہاڑ کے

میں چاہتا ہوں میرے برابر کا ہو حریف
افسوس ورنہ ہوگا یقیناً یہ پچھاڑ کے

جینا اگر ہے تجھ کو مُرادوں کے شہر میں
اپنی انانیت کو بھی آجا تو گاڑ کے

پیروں میں بانس باندھ کے انجمؔ وہ پست قد
خود کو سمجھ رہا ہے مساوی ہوں تاڑ کے

کچھ جیالے تلاش کرتے ہیں
دل کے چھالے تلاش کرتے ہیں

اپنی محنت کو دھوپ میں بو کر!!
ہم نِوالے تلاش کرتے ہیں

شہر آ کر بھی چھاؤں برگد کی
گاؤں والے تلاش کرتے ہیں

اِس جگہ گولیاں چلیں ہم پر
آپ بھالے تلاش کرتے ہیں

جن کا ہوتا ہے شوق ٹکرانا!
وہ ہمالے تلاش کرتے ہیں

ہم تو سورج کو طاق میں رکھ کر
کچھ حوالے تلاش کرتے ہیں

وہ نمائش کا اِک کھلونا ہیں
لینے والے تلاش کرتے ہیں

مَرنے والوں کی جائیداد انجمؔ
جینے والے تلاش کرتے ہیں

○

یوں رُوٹھ کے جاؤ نا برسات کے موسم میں
اِک حشر اٹھاؤ نا برسات کے موسم میں

دے دو مری نظموں کو ہونٹوں کا کنوارا پن
اک گیت سناؤ نا برسات کے موسم میں

میں کب سے ترستا ہوں پینے کو مئے اُلفت
آنکھوں سے پلاؤ نا برسات کے موسم میں

لفظوں کی رواداری لگتی ہے اداکاری
آنکھوں سے سناؤ نا برسات کے موسم میں

چمپا ہے چنبیلی ہے اور موگرا بیلا بھی
گل اور کِھلاؤ نا برسات کے موسم میں

تنہائی مری اب تو کاٹے سے نہیں کٹتی
گھر میرا بساؤ نا برسات کے موسم میں

میں مور نہیں کوئی پر ناچ تو سکتا ہوں
ہم رقص بناؤ نا برسات کے موسم میں

ہلکا سا اشارہ ہے موسم کا حفیظ انجم
دل میرا لبھاؤ نا برسات کے موسم میں

○

دنیا نئی بسائے گی اکیسویں صدی
گھر چاند پر بنائے گی اکیسویں صدی

حالات کہہ رہے ہیں یہی چیخ چیخ کر
انسانیت مٹائے گی اکیسویں صدی

خدشہ یقین بنتا چلا جا رہا ہے آج
ناری کو نر بنائے گی اکیسویں صدی

مذہب کے نام پر کبھی نسلوں کے نام پر
فتنے کئی جگائے گی اکیسویں صدی

ہرگز نہ دسترس میں کسی کے وہ آئے گی
دوزخ نئی بنائے گی اکیسویں صدی

مظلوم آدمی کی سُنے گا کوئی نہیں
آنکھوں سے خوں رُلائے گی اکیسویں صدی

انجمؔ خدا دِکھایا تو دیکھیں گے ہم ضرور!
کیا کیا یہ گُل کھلائے گی اکیسویں صدی

کسی کی روک کہاں ہے مرے خیالوں پر
غزل میں کہہ جو رہا ہوں نئے حوالوں پر

خود اپنے ذہن کے جالوں کو دیکھتا ہی نہیں
وہ ڈالتا ہے نظر میرے گھر کے جالوں پر

ہمارا گاؤں بھلا اور گاؤں والے بھلے
بھروسہ کون کرے آپ شہر والوں پر

یہ لکھنے پڑھنے کے اور کھیل کود کے دن ہیں
یہ کس نے لاد دیا وزن نونہالوں پر

انہیں خیال ہمارا ہی آگیا شاید !!
شفق کی لالی ابھر آئی ہے گالوں پر

ابھی جوان ہوا ہے مرا دلِ ناداں
سفیدی آئی کہاں سے نجانے بالوں پر

تو سنگ دل ہے تو میں موم دل ہوں یاد رہے
اُلجھنے والا نہیں ہوں ترے سوالوں پر

تمام اپنے پرائے ہوئے حفیظ انجم
ہیں نفرتوں کے طمانچے ہمارے گالوں پر

○

تو ایسا آنکڑا ہے جو کسی بھی مد میں نہیں
زمانہ جانتا ہے تو کسی عدد میں نہیں

مری برابری کرتا ہے میرے قد میں نہیں
پھر اِس پہ جھوٹ بھی کہتا ہے میری کد میں نہیں

یہ دیکھتے ہی تعجب میں پڑ گیا ہوں میں
کہ تیرا نام ہی تیری کسی سند میں نہیں

میں تیرے جیسا بُرا آج تک نہیں دیکھا
ترا شمار مگر حیف ہے کہ بد میں نہیں

تمام شہر میں شہرت ہے نیک نامی کی
اگرچہ اُس کی ہی اولاد اس کی حد میں نہیں

یہ سرد آگ ہے بہتر ہے اس سے دور رہیں
جناب سچ ہے کوئی فائدہ حسد میں نہیں

جو ہر قدم پہ مسائل سے بھڑتے ہو انجم
یہ کاوشیں تو کسی اور کی رسد میں نہیں

○

اپنی خودی جو بیچ کے اوتار بن گئے
انسانیت کا بولتا شہکار بن گئے

جچتی نہیں دکان شرافت کی کیوں ہمیں
جب سے زمانے تیرے خریدار بن گئے

دنیا کے اس وسیع سمندر میں جا بجا
اہلِ ہوس کے نام کے بازار بن گئے

جھرنا تھے ایک جھیل تھے سب کیلئے مگر
کیوں میرے حق میں بولئے کہسار بن گئے

دیوار و در کی چھت کی نگارش میں کیا کہو
بارش ہوئی تو سینکڑوں آکار بن گئے

لاشوں کے ڈھیر اور یہ جلتے ہوئے مکاں
حیوانیت کا آپ کی اظہار بن گئے

دولت کی ریل پیل کا غازہ اتر چکا
انجمؔ وہ آج پھر سے ملنسار بن گئے

تیری میری خطا کے ہوتے ہیں
فاصلے سب انا کے ہوتے ہیں

مسئلے انتہا کے ہوتے ہیں
تجربے بھی بلا کے ہوتے ہیں

دوستی میں جو گھونپتے ہیں چھرا
مستحق وہ سزا کے ہوتے ہیں

ہر کسی کے وہ کام آتا ہے
ہاتھ کتنے خدا کے ہوتے ہیں

بے ایمانی کا کاروبار نہ کر
اس میں گھاٹے بلا کے ہوتے ہیں

چل پڑو نام لے کے مولا کا
راستے سب خدا کے ہوتے ہیں

آپ نے جو دیئے تھے گھاؤ ہمیں
خوبصورت بلا کے ہوتے ہیں

دوست اپنے بھی کیا کہوں انجم
خوش ہمیں وہ رلا کے ہوتے ہیں

متانتوں کا مری اور کیا صلہ دے گا
بلندیوں سے کسی وقت بھی گرا دے گا

جو دشمنوں کیلئے اپنا مورچہ دے گا
ضرور توں یہ اُسے کون آسرا دے گا

نہ لاٹھی ٹوٹنے والی نہ سانپ مرنے کا
ہر ایک بات کا وہ مسئلہ بنا دے گا

وہ شر پسند ہے فطرت بدل نہیں سکتی
جہاں بھی جائے گا آپس میں وہ لڑا دے گا

نہ بات چیت ہوئی اور نہی علیک سلیک
میں جانتا تھا کہ وہ اس طرح بھلا دے گا

انا کے بھن یہ ترے وار ہے ہتھوڑے کا
یہ غم وہ غم ہے تجھے دیکھ لے ہلا دے گا

میں دے رکھا ہوں اُسے چھوٹ اسلئے انجم
وہ میرے نام کی اک دستخط لگا دے گا

خوشی میں غم میں سدا ہم جو مسکراتے ہیں
اسی لئے تو کہاں کب سمجھ میں آتے ہیں

تھپیڑے وقت کے ایسا سبق سکھاتے ہیں
اندھیرے بخت کے پھر شکل تک بھلاتے ہیں

کسی غریب کی کٹیا محل سے بہتر ہے!
وہ اپنے خون پسینے سے جو بناتے ہیں

حسد کا روگ ہے یہ ایڈس سے بھیانک ہے
اسی کو لوگ مگر کیوں گلے لگاتے ہیں

عجب نہیں کہ وہ کل خود مذاق بن جائیں
جو دوسروں کا ہمیشہ مذاق اڑاتے ہیں

عجیب ذہن ہے ان کا ہیں یہ ضمیر فروش
قدم قدم جو نئی سازشیں رچاتے ہیں

یہ اس کا پیشہ ہے عادت ہے اور فطرت بھی
یہ غیبتی ہے اسے منہ کوئی لگاتے ہیں

انہیں کو آتا ہے جینے کا بھی مزا اے دوست
جو کر کے خون پسینہ یہاں کماتے ہیں

وہ خوش لباس بڑا بد مزاج ہے انجم
کیوں آزمائے ہوئے کو پھر آپ آزماتے ہیں

دھند چھٹ نہیں سکتی اپنی آنکھیں ملنے سے
خود بخود ہی چھٹتی ہے دھوپ کے نکلنے سے

کس قدر حقیقت ہے بات گو پرانی ہے
سو چراغ جلتے ہیں اک چراغ جلنے سے

روزگار ڈھونڈو تم اپنا رہگزاروں میں
زندگی نہیں بنتی پالنے میں پلنے سے

آپ کی بلندی سے انحراف ہے جن کو!
تالیاں بجائیں گے غار میں پھسلنے سے

راستوں کا ٹیڑھا پن بات ہے الگ لیکن
روکنا ضروری ہے، تم کو ٹیڑھا چلنے سے

مسکراتے موسم کا سبز سبز جوبن ہے
ندیاں جو بہتی ہیں برف کے پگھلنے سے

شعر گرچہ کہنا ہے شعر میں ہے ترجاوُ
ماہیت پلٹتی ہے لفظ کے بدلنے سے

آدمی وہی ہوگا سانپ جیسا زہریلا!
فائدہ نہیں انجم تختیاں بدلنے سے

جو درد عندلیب کی آواز سے جگا
وہ سوز اپنے ساز میں آغاز سے جگا

بیٹھا ہوا ہوں کب سے پروں کو سمیٹ کر
اے خوش جمال مجھکو تو پرواز سے جگا

میں دے چکا ہوں چھوٹ ہر اک بات کی تجھے
اے صبح انتظار مجھے ناز سے جگا

چلنا ہے ساتھ کاندھے سے کاندھا لگا کے چل
اُٹھ آج اپنی قوم کو آواز سے جگا

وہ بھی نہ بچ سکے گا یہاں سر جنگ ہے
معصوم رہ نورد کو اس راز سے جگا

موہوم حسرتوں کا خلاصہ میں کرسکوں
تکریم اسے جگا کہ تگ و تاز سے جگا

ہر بات اپنے دور کی شایان شان رکھ
انجم تو ہر قدم اسی انداز سے جگا

عقائد کی تجارت سامنے تھی
شکستہ آدمیت سامنے تھی

مرا دل اوب جانا لازمی تھا
بڑائی کی علامت سامنے تھی

سب اس کے پاؤں چھوتے جا رہے تھے
بس اک اندھی عقیدت سامنے تھی

ملانا ہاتھ میں بھی چاہتا تھا
مگر اس کی رعونت سامنے تھی

ہماری نیند جب ٹوٹی تو دیکھا
گھڑی لیکر شکایت سامنے تھی

جگر پاشی سے حاصل کچھ نہ ہوگا
کدورت ہی کدورت سامنے تھی

تھا اندھوں میں وہی اک کانا راجہ
یہی زندہ حقیقت سامنے تھی

میں کیسے جھوٹ کہتا چور سے تک
مری ماں کی نصیحت سامنے تھی

میں انجم آنکھ کیسے پھیر لیتا!!
نظر بھر کر ضیافت سامنے تھی

قطرہ قطرہ خلوص ضم کر لو!
اس طرح خود کو محترم کر لو!
دل کی خِفّت ذرا سی کم کر لو!
اپنا دامن ہی کچھ تو نم کر لو!
کیا پتہ کل کوئی لکھے نہ لکھے
اپنی تاریخ خود رقم کر لو!
چوری کرنے سے یہ تو بہتر ہے
انگلیاں اپنی خود قلم کر لو!
میں بھی ہوں ایک برگِ آوارہ
مجھ کو چاہو تو ہم قدم کر لو!
خود شناسی تمہیں ضروری ہے
فاصلے اور کم سے کم کر لو!
آ گئے بونوں کی بھیڑ ہے انجمؔ
اپنی گردن ذرا سی خم کر لو!

ہونے کو ہے شام شکاری
کیا ہے ترا شبھ نام شکاری

یہ نہ سمجھ تو بچ پائے گا
تاک میں ہے انجام شکاری

وقت شکنجہ کستا ہو گا
پگ پگ ہیں اوہام شکاری

جان بچا لینی ہے مجھکو!
کتنے دوں میں دام شکاری

میں بھی ہوں آزاد پرندہ
تو بھی ہے گمنام شکاری

میرا جیون درپن درپن
تو ٹھہرا بدنام شکاری

کل جگ میں سب یوں کہتے ہیں
راون کو ہی رام شکاری

کل یہ کھلے گا عقدۂ انجمؔ
کون تھا وہ گلفام شکاری

بات اس کی ہے ذات اس کی ہے
نگہِ التفات اس کی ہے

راہِ حق میں نجات اس کی ہے
در حقیقت حیات اس کی ہے

ہو گئے ششدر جو دیکھتے ہیں سبھی
آج نکلی برات اس کی ہے

جیت پر جیت ہو رہی ہے مری
مات پر آج مات اس کی ہے

جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتی
کیا کہوں واردات اس کی ہے

جس کے ماں باپ بھائی بہن نہیں
صرف تنہا وہ ذات اس کی ہے

ذرّے ذرّے پہ راج ہے اُس کا
ساری یہ کائنات اس کی ہے

میری باتوں میں صندلی ہے مہک
ذکر اس کا ہے بات اس کی ہے

نیند آتی نہیں حفیظ انجم
نیند جس کی ہے رات اُس کی ہے

حق گو سے ہر قدم پہ مصیبت یہی تو ہے
ہوتا ہی تلخ تر وہ حقیقت یہی تو ہے

بدبخت جانتا ہی نہیں، ایسا بھی نہیں!
خود کو عظیم کہنا جہالت یہی تو ہے

خاموش سنتا رہتا ہے کیوں بولتا نہیں
عالم کی سادگی سے شکایت یہی تو ہے

اولاد گرچہ نیک ہو صالح بھی ہو اگر!
نعمت اسی کو کہتے ہیں نعمت یہی تو ہے

رسّی تو جل گئی ہے مگر بل نہیں گیا
مجھکو جناب والا پہ حیرت یہی تو ہے

کوّے کو جھوٹے ہاتھ سے تک مارتا نہیں
کنجوس کی شناخت کہاوت یہی تو ہے

ہم سوچتے کچھ اور ہیں ہوتا کچھ اور ہے
قدرت اسی کا نام ہے قدرت یہی تو ہے

پانی پلا پلا کے گلا کاٹتے ہیں لوگ
اس دور میں جناب شرافت یہی تو ہے

انجم دلوں کو جوڑنا ہے توڑنا نہیں!!!
میری نظر میں دوست فراست یہی تو ہے

اشکوں کے سمندر میں نہایا نہیں جاتا
ہم سے تو کسی حال یہ دیکھا نہیں جاتا

میں تیری حویلی کا کوئی پیڑ نہیں ہوں
کیوں پھر بھی پنپتا ہوا دیکھا نہیں جاتا

امرائی میں خوشبو ہے بسی تیرے بدن کی
نظروں سے مری تیرا سراپا نہیں جاتا

مشکل سے بنایا ہوں چھوٹا سا گھروندہ
احباب سے کیوں میرے یہ دیکھا نہیں جاتا

یہ کیسا تماشا ہے کہ سب دیکھ رہے ہیں
کیوں ڈوبتے سورج کو بچایا نہیں جاتا

بہتر ہے کہ چپ سادھ لے خاموش بھی ہو جا
اک لفظ بھی کھل کر جہاں بولا نہیں جاتا

ہے فکر اسی بات کی ماں باپ کو انجم
کیوں گھر کے کسی کام پہ بیٹا نہیں جاتا

رنجشوں کی پھوار مت کرنا
دشمنی پائیدار مت کرنا

جس کو سر ڈھنے پہ پھینک دیتے ہیں
زندگی وہ انار مت کرنا

بات رکھنا جدید لہجے میں
اس کو غلطی شمار مت کرنا

راحتِ جاں ہے یاد کی خوشبو
زندگی سے فرار مت کرنا

شہر بازار ہے سیاست بھی
اس کا تم اعتبار مت کرنا

روز ہی روٹی کمانے نکلا ہوں
میری محنت اُدھار مت کرنا

آج اُترے گا چاند آنگن میں
شب میں سولہ سنگھار مت کرنا

میں تو چھتا ہوں شہد کا انجم
دشمنوں میں شمار مت کرنا

زندگی اشتہار مت کرنا
خود کو تو داغدار مت کرنا

کب کسی کا یہ ساتھ دیتی ہے
ایسی دنیا سے پیار مت کرنا

یہ تو مٹنے کی شئے ہے مٹنے دو
قبر کو پائیدار مت کرنا

کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا
آپ محنت سے عار مت کرنا

سب یہاں باشعور بیٹھے ہیں
بات تم ناگوار مت کرنا

صرف لفظوں سے کھیلنے کیلئے
شاعری اختیار مت کرنا

کوئی انگلی اٹھائے مجھ پر بھی
ایسا پروردگار مت کرنا

تر نوالوں کی چاہ میں انجم
زندگی زیر بار مت کرنا

میں تو خوشبو ہوں فضاؤں میں بکھر جاؤں گا
روح میں دل میں میں سب کے ہی اتر جاؤں گا

دیکھنا ہے مجھے دُنیا کا جو اصلی چہرہ!
میری آنکھوں میں لئے تیری نظر جاؤں گا

میں جُدائی کے تصور سے لرز جاتا ہوں
ایک پل تجھ سے جو بچھڑوں گا تو مر جاؤں گا

وہ دیالو ہے بڑا میں نے بھی سُن رکھا ہے
اس کی دہلیز پہ با دیدۂ تر جاؤں گا

اب ملاقات مری خود سے نہیں ہو پاتی!
خود سے ملنے کیلئے بارِ دگر جاؤں گا

رہزنی تیری بھلا روک سکی کب مجھکو؟
میں گھٹا ٹوپ اندھیروں سے گزر جاؤں گا

جھونپڑی اپنی مجھے تاج محل لگتی ہے
میں کسی قصر پہ کیوں خاک بسر جاؤں گا

میں ارادوں کو بدلتا ہی نہیں انجم لیکن
آپ کہتے ہیں تو کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا

تو چاہتا تھا بُرا ہو بھلا ہوا میرا
قدم قدم پہ مرے ساتھ تھا خدا میرا

ہمیشہ آپ دکھاتے ہیں سادہ لوحی کیوں
مجھ ہی سے پوچھ رہا ہے یہ تجربہ میرا

تم اپنی ہار کو تسلیم کیوں نہیں کرتے
پھر آج کرنے چلے ہو مقابلہ میرا

مری نگاہ میں انساں نہیں وہ راکشس ہے
سمجھ رہے ہیں جسے لوگ دیوتا میرا

کوئی رقیب نہ آئے گا اب تعاقب میں
مٹا دیا ہے کسی نے نشانِ پا میرا

ہر آدمی کی زباں پر یہی شکایت ہے
وہ جانتا ہی نہیں کیا ہے مرتبہ میرا

تمام یادوں کے پیکر سے دیئے ہوئے ارشن
ہوا ہے آپ سے جو آج سامنا میرا

میں بات رکھتا ہوں اپنی جدید لہجے میں
ہے رنگ ڈھنگ زمانے سے جو جدا میرا

لگا کے دیکھ بھی لے زور اپنی چوٹی کا
نہ ٹوٹ پائے گا انجم یہ حوصلہ میرا

سگندھ بن کے ہمیں دور تک بکھرنا ہے
دل و دماغ میں ہر شخص کے اترنا ہے

اڑان بھرنے لگے ہیں غلط دشاؤں میں
کبوتروں کے ذرا بال و پر کترنا ہے

میں سانجھ ہوں نہ کوئی نقرئی سویرا ہوں
ہوں ایک عزم کا سورج مجھے ابھرنا ہے

نئی زمین نیا آسمان چاہئے گی
پرانے خول میں کس کو یہاں ٹھہرنا ہے

نہ حرف آئے کبھی ایکتا پہ اے بھائی!!!
ہمیں تمام مذاہب سے پیار کرنا ہے

ہمارا دیش ہے گوتم کا اور گاندھی کا
یہاں سے خون کی ہولی کو دور کرنا ہے

عناد، دشمنی، نفرت، حسد سے حاصل کیا؟
یہ طے ہے دوست کسی روز سب کو مرنا ہے

میں اس کی صبح سے واقف ہوں اور شام سے بھی
ہے اس کا کام ہی سب کے کان بھرنا ہے

شفق کے رنگ بکھیرے گی زندگی انجم
ہمیں تو راہِ غلط سے گریز کرنا ہے

اس سے پہلے اس طرح وہ منکشف ہوتا نہ تھا
چہروں کی اس بھیڑ میں بھی آج تک بیٹھا نہ تھا

میری رسوائی پہ حیرانی عبث ہے آپ کی
اس جہاں میں کون آخر سوچئے رسوا نہ تھا

بھائی میرے جا چکے تھے مجھکو تنہا چھوڑ کر
وقت کے اندھے کنویں میں کوئی بھی میرا نہ تھا

میری فطرت بھی الگ تھی اس کی سازش بھی جدا
کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن دوست وہ میرا نہ تھا

زندگی کی صبح شام اک عید تھی میرے لئے
غم کی انگیٹھی جلا دے میں کبھی بیٹھا نہ تھا

رابطوں کا پل ہمیشہ کیلئے توڑا گیا!!!
صلح جوئی کا مگر اک سلسلہ ٹوٹا نہ تھا

اُن کے رخساروں پہ میں بھی کس لئے تل ڈھونڈتا
میرے ماتھے پر بھی کوئی صبح کا تارا نہ تھا

کارگل کی جنگ ہو کہ زندگی کی جنگ ہو
یہ سپاہی ہند کا انجم کبھی ہارا نہ تھا

یوں لعن طعن نہ کر اور اب شبِ ہجراں
میں کیا سناؤں تجھے تشنہ لب شبِ ہجراں

یہ سادگی ہی مری اوڑھنا بچھونا ہے
تو مانگتی ہے مرا کیوں نسب شبِ ہجراں

اُتر چکا ہے نشہ دیکھ چڑھتے سورج کا!!
ہے یاد آنے لگی مجھ کو اب شبِ ہجراں

مجھے تو اپنی نگاہوں سے مت گرا دینا
یہ التجا ہے مری با ادب شبِ ہجراں

وہ رنگ و نور کے جلوؤں میں کھو گیا ہوگا
ہے میرا حال یہاں ابکے تب شبِ ہجراں

بچا بھی کیا ہے مرے پاس سونپنے کیلئے!!
میں دے چکا ہوں تجھے اپنا سب شبِ ہجراں

وہ فیصلے کی گھڑی بھی عجیب تھی انجم!
مری زباں سے نکلا غضب شبِ ہجراں

دور سے وہ جو پھول لگتا ہے
پاس جاؤ ببول لگتا ہے

جب سے جاگی ہے وصل کی خواہش
یہ سفر مجھ کو طول لگتا ہے

مسکراتا ہر ایک طفل مجھے
ایک جنت کا پھول لگتا ہے

میرا غم آج بھی مرے حق میں
باادب یا اصول لگتا ہے

بات رکھنا یہاں شرافت کی
اس صدی میں فضول لگتا ہے

سب کو نیچا دکھانا باتوں میں
اُس کا اپنا اصول لگتا ہے

آؤ جنت ہی مانگ لیں رب سے
اس کا دینا اصول لگتا ہے

کوئی اتنا قریب ہے انجمؔ
میرے ماتھے کی دھول لگتا ہے

جب سے وہ مہربان ہے بابا
دل مرا شادمان ہے بابا

جیت ہوتی ہے ہار ہوتی ہے
زندگی امتحان ہے بابا

اس طرف میں ہوں اُس طرف تو ہے
اور انا درمیان ہے بابا

آج دشواریوں کا موسم ہے
سب کی خطرے میں جان ہے بابا

چار سُو آگ کی لپٹیں ہیں
اور گھرا ورتمان ہے بابا

آج کا حال کر رہا ہے رقم
مجھ میں جو فاہیان ہے بابا

جس کو اردو زبان کہتے ہیں
سب سے پیاری زبان ہے بابا

جانتا خوب ہے حفیظ انجم
کس کی کتنی اُڑان ہے بابا

وہ کاوشوں سے مجھے آگہی میں لے آیا
بڑے جتن سے نئی زندگی میں لے آیا

میں وقف ہو بھی چکا تھا جو تیرہ راتوں کے
ترا خیال مگر روشنی میں لے آیا

یہ اشتیاق بڑا ہی عجیب ہوتا ہے
یہی تو دل ہے جو دردسری میں لے آیا

اسی کا نام مقدر ہے اور کیا کہیئے
وہ اپنے شہر کی ویراں گلی میں لے آیا

پھر آج شیشوں کو پتھر پہ توڑ ڈالے گا
وہ آج پھر سے مجھے بارہ دری میں لے آیا

میں دوستی کی فضاؤں میں بات کرتا ہوں
کیوں خواہ مخواہ مجھے دشمنی میں لے آیا

ترے جمال کا پرچم بلند کرنا تھا
یہی خیال مجھے شاعری میں لے آیا

ہے خامشی میں بھلائی بھی اور دانائی
تمہارا عشق مجھے خامشی میں لے آیا

ہے وقت کم مجھے لکھنا ہے ڈھیر سا انجم
یہ خوف آج مجھے جاں کنی میں لے آیا

بات کرتی ہے وہ اثر والی
شاخ گویا ہے اک ثمر والی

شہر میں آ بسے ہیں ہم جب سے
چھاؤں ملتی نہیں شجر والی

کچھ کہو اپنی، یا سنو میری
ہے خبر یہ اُدھر اُدھر والی

بزدلی موت سے بھیانک ہے
بات کوئی کرو جگر والی

میں سفر پر چلوں تو کیسے چلوں
بند کھڑکی ہے رہ گزر والی

آپ سے یہ مری گذارش ہے
بات کیجے کوئی ہنر والی

کس نے کیا کہہ دیا تمہیں آخر
بات کھلنے لگی سفر والی

کیسے دیکھیں گے آپ انجم کو
آنکھ ہی جب نہیں نظر والی

بات دانشوروں میں اُتری ہے
زندگی شبدوں میں اُتری ہے

ایک خواہش تھی تجھ سے ملنے کی
آج کل موسموں میں اُتری ہے

کیا ترقی اسی کو کہتے ہیں
موت بن کر بموں میں اُتری ہے

آسمانوں کو چھو نہیں سکتا
گرچہ قوت پروں میں اُتری ہے

کیا ضرورت ہے اور کہنے کی
بات دل کی خطوں میں اُتری ہے

تو بھی اک کوہِ قاف کی ہے پری
تیری رنگت گلوں میں اُتری ہے

جھنجھناتے ہیں دل کے تار مرے
بات تیری سُروں میں اُتری ہے

بند کمروں کی اب سیاست بھی
بستیوں جنگلوں میں اُتری ہے

اک گھٹن ہے عجب سی انجم
جو دلوں سے دلوں میں اُتری ہے

پروں کو اک نیا انداز دے کر دیکھ لیتے ہیں
پرندے کو نئی پرواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

اُنہیں اک بار پھر آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں
محبت کو نیا آغاز دے کر دیکھ لیتے ہیں

پھنسے ہیں ہم جو دلدل میں کوئی سُنتا نہیں اپنی
کسی بہرے کو ہی آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

مصیبت میں سب ہی رب کو یقیناً یاد کرتے ہیں
خوشی میں بھی اُسے آواز دے کر دیکھ لیتے ہیں

سیاست بھول جاؤ گے ملن کے گیت گاؤ گے
تمہارے ہاتھ میں بھی ساز دیکر دیکھ لیتے ہیں

وہ قتل و خوں بھی کرتے ہیں وہی دنگے مچاتے ہیں
مسیحا کا انہیں اعجاز دیکر دیکھ لیتے ہیں

ہمارے شعر پر بھی تبصرہ کیجئے حفیظ انجم
کسی دن یہ تمہیں اعزاز دے کر دیکھ لیتے ہیں

یاد پیا کی لے آتی ہے جب آتی ہے پاگل شام
میری دنیا کر جاتی ہے اس کی آنکھ کا کاجل شام

ایک دشا میں کب رہتی ہے جیون کی یہ بیکل شام
کچھ تو کومل کچھ تو نرمل کچھ تو شیتل بوجھل شام

رکھتا ہوں میں اپنے اندر دھیرج اور منوبل بھی!
دیکھ چکا ہوں میں بھی آخر کیا ہیں تیرے کس بل شام

دن سارا جو بیتا میرا دھوپ کے تپتے صحرا میں
باندھ کے اپنے آنچل میں وہ لے آئی ہے کومل شام

من کا میورا ناچ اُٹھا ہے سُدھ بدھ کھو کر جھوم اٹھا
کتنے یگوں کے بعد آئی ہے آج یہ صندل صندل شام

دیکھ ابھاگا ہوں میں کتنا قیدی غم کے چُنگل کا
بے بس بے کس کر دیتی ہے روز ہی مجھ کو دلدل شام

میں بادل ہوں ممتا جوگی پیار نچھاور کرتا ہوں
وہ اک مورت سُندرتا کی اور کنواری چنچل شام

ایسے میں کچھ اور زیادہ ہو جاتا ہوں تنہا میں
آگ لگاتی ہے سینے میں انجم جل تھل جل تھل شام

چاند کے عکس سا لگا چہرا
جھیل میں جب اتر گیا چہرا

روٹھ جاتی ہے نیند آنکھوں سے
یاد آتا ہے جب ترا چہرا

اس کی آنکھیں تھیں جھیل سی گہری
تھا کنول کی طرح کھلا چہرا

میں نے اپنے لئے پسند کیا
سارے چہروں میں اک ترا چہرا

کیسے ڈھونڈوں میں کیسے پہچانوں
وہ بھی اپنا بدل لیا چہرا

اس کے اطوار ہوں تو کچھ بھی ہوں
دوست ہوتا نہیں برا چہرا

اور پاکیزہ لگ رہا ہے مجھے
آنسوؤں سے دھلا دھلا چہرا

وقت تھم سا گیا ہے دیکھو تو
جب بھی ہاتھوں میں آ گیا چہرا

وقت کی گرد نے حفیظ انجم
کتنا دیکھو بدل دیا چہرا

میرے حق میں دیکھئے بہتر بنے
ہوتے ہوتے زخم بھی دلبر بنے

خامشی بھی اس قدر اچھی نہیں
بُت بنے کیوں آپ بھی پتھر بنے

سبز موسم آگیا ہے جانِ جاں
میری نظروں میں ہرے منظر بنے

اک ادھوری داستاں لکھنا ہے اب
آ بھی جاؤ کاغذی پیکر بنے

شیشہ گر تھے ہم بھی اپنے گاؤں میں
پتھروں کے شہر میں پتھر بنے

ہر طرف ہے اب سیاسی توڑ جوڑ
جب سے ہیں بگلا بھگت رہبر بنے

جانے کب آئے یہاں پر انقلاب
دیکھنا ہے زیست کب بہتر بنے

انجمؔ اُن کی آن پر آئے نہ آنچ
گھر ہمیشہ ہی رہیں یہ گھر بنے

تمہارا رنگ کتابِ سخن میں آئے کبھی
تمہارا رُوپ مرے فکر و فن میں آئے کبھی

میں چھُو کے گل کو جو محسوس کر رہا ہوں
وہ تازگی تو کسی کے بدن میں آئے کبھی

ہر ایک شاعر و فنکار کی یہ خواہش ہے
کہ اُس کا نام ترے لوحِ تن میں آئے کبھی

بدل بدل کے کئی زاویوں سے دیکھوں گا
تمہارا حُسن نئے پیرہن میں آئے کبھی

میں آج کھُل کے ملوں اس سے بے حجابانہ
یہ اشتیاق تمہارے بھی من میں آئے کبھی

چھبی کسی کی میں دیکھوں گا چاند راتوں میں
ہے شرط اتنی کہ چشم زدن میں آئے کبھی

عمرؓ نے جس کو تھا نافذ کیا حفیظ انجم
وہی نظام ہمارے وطن میں آئے کبھی

خود اپنی پہچان ہوں میں
اک ٹوٹا سا مان ہوں میں

تیری کہانی کیا لکھوں!!
خود سے بھی انجان ہوں میں

اک شب کی تو ملکہ بن
اک دن کا سلطان ہوں میں

اپنے اندر ڈھونڈے مجھے
کھویا ہوا ارمان ہوں میں

پاس میرے اب دولت ہے
ہر محفل کی جان ہوں میں

میرے دل میں جھانک کے دیکھ
بوجھ مجھے آسان ہوں میں

مندر مسجد مجھ میں ہیں
اک سیدھا انسان ہوں میں

ہند کی لکھوں گا تاریخ
آج کا فاہیان ہوں میں

جنگ کا وہ اعلان انجم
پیار بھرا فرمان ہوں میں

کسی بھی پیڑ سے پودے سے چل کے یاری کر
پُرانی باتوں پہ ہرگز نہ آہ و زاری کر

دِوانہ وار اُنہیں چاہنے پہ تہمت ہے
خود اپنے آپ پہ اے دوست سنگساری کر

یہ انتہائی ضروری ہے ہر بشر کیلئے!!!
دل و نگاہ میں پیدا تو انکساری کر

تو کھیل کھیل چکا سارے دُنیاداری کے
ہے اختتام ترا کچھ تو دینداری کر

تری زبان کے تاثیر سے میں واقف ہوں
کِھلا کے پھول دلوں کو حسین کیاری کر

اس ایک حال پہ دنیا کبھی نہیں رہتی
فضول باتوں سے دل کو نہ اپنے بھاری کر

تری بھلائی کسی دن تو کام آئے گی
ہر اک برائی پہ اپنا تو خوف طاری کر

بُجھا بُجھا سا مرا آج ہے دلِ ناداں
خلوص و مہر کی انجمؔ تو آبیاری کر

یہاں زمیں کی وہاں آسماں کی قید میں ہیں
یہ تیرے بندے سدا امتحاں کی قید میں ہیں

تمہارا طرزِ تکلّم کہ چلتا جادو ہے!!!
ہم آج بھی اُسی لطفِ بیاں کی قید میں ہیں

جو اپنا وعدۂ فردا بھلا نہیں سکتے!
کچھ ایسے لوگ ابھی تک زباں کی قید میں ہیں

کسی سے کوئی سروکار تک نہیں رکھتے!
عجیب لوگ ہیں وہم و گماں کی قید میں ہیں

یہ جانتے ہی نہیں کیا ہے اُن کی اصلیت
کچھ ایسے فریبی خوابِ گراں کی قید میں ہیں

ہمارے دیش کے حالات آج کچھ بھی ہوں
تمام واسی تو امن و اماں کی قید میں ہیں

شفیق ماں تھی مری باپ بھائی بہنیں تھیں
تمام یادیں اسی سائباں کی قید میں ہیں

وہ ہمسفر ہیں مرے اور ہمقدم انجم
اسی لئے تو مری داستاں کی قید میں ہیں

ہم تو بچوں سے بھی جھک جھک کے ملا کرتے ہیں
سادگی پر ابھی احباب ہنسا کرتے ہیں

ہم کو آتا ہے یہی کام کیا کرتے ہیں
دشمنوں، آپ کے حق میں بھی دعا کرتے ہیں

نہ زیادہ کا ہے لالچ نہ تو کم کا شکوہ
ہم تو ہر حال میں بس شکرِ خدا کرتے ہیں

میں تو خوش رہنے کی تلقین کیا کرتا ہوں
رنج و آلام کہاں تیرا بھلا کرتے ہیں

ایسے ملاحوں کی کشتی پہ سفر مت کرنا
بیچ منجدھار میں جو تم سے دغا کرتے ہیں

یاد آتی ہے دبے پاؤں تری جب دل میں
رات بھر شمع کی مانند جلا کرتے ہیں

اپنی قسمت میں کہاں نازِ عروساں ہونا
پھول مرجھائے ہوئے ہم سے کہا کرتے ہیں

شرط ہے اس پہ عمل کرنے کی ورنہ انجم
میٹھی باتیں تو سبھی لوگ کیا کرتے ہیں

تمہاری زلف لہرانے لگی ہے
گھٹا جو اس قدر چھانے لگی ہے

ابھی کچھ دیر میں ہو گا سویرا
ملن کی آس بھی جانے لگی ہے

جنھیں دل سے بُھلانا چاہتا ہوں
اُنھیں کی یاد کیوں آنے لگی ہے

لبوں پر کھیلتی ہے مسکراہٹ
خموشی بھی غضب ڈھانے لگی ہے

وہ اٹھلاتے چلے جو آرہے ہیں
ہماری زیست بل کھانے لگی ہے

نہ جانے آج کیا ہے ہونے والا
طبیعت پھر سے گھبرانے لگی ہے

بہاروں کا ہے موسم اور کوئل
برہ کے گیت اب گانے لگی ہے

یوں کب تک اوڑھ کر سوتے رہو گے
غریبی پاؤں پھیلانے لگی ہے

حدیثِ دلبراں سُنتا ہے انجم
تمنا ہے کہ غش کھانے لگی ہے

یہ کس نے کہا آپ سے پیچیدہ بہت ہوں
میں نظمِ گلستاں ہوں جہاں دیدہ بہت ہوں

تو نے مجھے کیا چیز پلائی تھی شبِ وصل
اے یار ترا آج بھی گرویدہ بہت ہوں

اک بار تو کیا میں یہی سو بار کہوں گا!!!
میں تیری ملاقات کو سنجیدہ بہت ہوں

ہر زخم مرا تجھ سے بصد شوق کہے گا!!!
ہیرے کی طرح میں بھی تراشیدہ بہت ہوں

یادوں کے تلاطم میں گھرا دیکھ کے مجھکو!
احباب سمجھتے ہیں کہ رنجیدہ بہت ہوں

میں موت سے کم ڈرتا ہوں غیبت سے زیادہ
پر سچ یہ ہے کہ اس نام سے لرزیدہ بہت ہوں

ابجد سے بھی واقف وہ نہیں عشق کی لیکن!
اس پر بھی یہ کہتا ہے کہ غم دیدہ بہت ہوں

خاموش سمندر ہوں میں ادراک کا انجم
جب کہنے پہ آجاؤں تو شوریدہ بہت ہوں

کیا سُناؤں میں تیرہ بختی پر
تھا بھروسہ مجھے جو مانجھی پر

کیوں اکڑتا ہے جسمِ خاکی پر
بوجھ ہے تو تو آج دھرتی پر

بد تمیزی کا شاہکار ہیں آپ
ہے مقالہ جنابِ عالی پر

فائدہ کیا ملا ہے کھلنے کا
پھول مرجھا گیا ہے ٹہنی پر

سرد پانی میں آگ لگ جائے
تتلیاں تیرتی ہیں پانی پر

کتنی پیاری ہیں بولتی آنکھیں
خوب مصرع ہے چشمِ ساقی پر

کس زمانے میں سانس لیتے ہو
شعر کہتے ہو چوٹی کنگھی پر

دل نہیں ہے یہ سوکھا جنگل ہے
کیا کہوں دوست دل کی بستی پر

کالا نیلا پیلا بچھو
ہے یہ رنگ رنگیلا بچھو
آؤ ذرا اس سے بھی مل لیں
ہے یہ چھیل چھبیلا بچھو
سوچ سمجھ کر پاؤں دھرو تم
پگ پگ ہے زہریلا بچھو
بہت بڑا یہ پاکھنڈی ہے
ضدی اور ہٹیلا بچھو

چھپا دراڑوں میں رہتا ہے
لگتا ہے شرمیلا بچھو
کونوں کھدروں میں پلتا ہے
زہر میں لت پت گیلا بچھو
ڈنک سے اس کی سب واقف ہیں
کالا ہو کہ پیلا بچھو
آنگن میں جو رینگ رہا ہے
آیا نیا نویلا بچھو
دور رہا کرنا تم انجم
ناک میں ہے زہریلا بچھو

وفا کا نغمہ جہان بھر میں قدم قدم پر سُنائے جانا
انا کی دیوار کھوکھلی ہے گرائے جانا گرائے جانا
حلال روزی دِلائے جانا حلال روزی کھلائے جانا
ہمیشہ خوشیوں سے گھر ہمارے اے میرے مولا سجائے جانا

سبھی کی سُننا بُرا نہیں ہے بُرے عمل پر لگانا قدغن!
یوں اپنا دامن بُرائیوں سے بچائے جانا بچائے جانا
عجیب پہیلی ہے سُنتی ہی سکونِ دل اب کہاں ہے بھائی
محبتوں کا سفینہ لمحہ کہاں چھپا ہے بتائے جانا

تمہارا ظاہر ہمارا باطن بہت حسیں ہے بہت جواں ہے
دِکھائے جانا چھپائے جانا چھپائے جانا دِکھائے جانا
تمہارے عشرت کدے سلامت تمہاری شہرت تمہیں مبارک
ہماری دُنیا ہے بھائی چارہ یہی حقیقت بتائے جانا

میں اک قلندر ہوں ایک جھرنا ہے میرا مقسوم چلتے رہنا
تو اک پرندہ ہے گھونسلے کا تو شب بسیرا بنائے جانا

کوئی نہیں ہے یہاں شمالی کسی میں اِنسانیت نہیں ہے
یہ ایک سچ ہے اے میرے بھائی بلا جھجک تم سُنائے جانا
ہزیمتوں کا عجیب موسم ہے آج کل جو حفیظ انجم!
دلوں کے ماحول سے اسے تم ہٹائے جانا مٹائے جانا

زخم کہتا ہے ہرا ہو جاؤں گا
میں ترے گھر کا پتہ ہو جاؤں گا

اپنے حق میں گو گر میں نقصان ہوں
تیرے حق میں فائدہ ہو جاؤں گا

پیار سے آواز دے کر دیکھیے
میں محبت میں فنا ہو جاؤں گا

آپ سے ٹوٹا اگر یہ ارتباط
میں خود اپنی سزا ہو جاؤں گا

دہر میں وہ باعث عبرت بنا
جو کبھی کہتا تھا خدا ہو جاؤں گا

میں بھی اڑ کر جاؤں گا سوئے فلک
جب غریبوں کی دعا ہو جاؤں گا

جھوٹ کہنے کی مجھے عادت نہیں
سچ بتا کر میں برا ہو جاؤں گا

میرے فن کی قدر کیجے تو کبھی
میں بھی انجم آپ کا ہو جاؤں گا

اک سمندر ہوں بیکراں لکھنا
خود کو اپنا مزاج داں لکھنا

ہر طرف ہے چھڑی مہابھارت
بھیشم لیٹا ہے رائیگاں لکھنا

ہے کرن کی اماں میں دُریودھن
سخت مشکل ہے امتحاں لکھنا

کرشن کے رن میں آتے آتے تک
کیا بچے گا یہ کارواں لکھنا

رات بھر میں ستارے گنتا ہوں
جب سے لوٹا ہے سائباں لکھنا

خوں رُلاتی ہیں جو غریبوں کو
کرفیوں کی وہ سختیاں لکھنا

دل مرا ایک خشک صحرا ہے
اس میں میٹھا بھی ہے کنواں لکھنا

یہ قیامت بھی آج ہونی تھی
کیوں ہوئے ہم پہ مہرباں لکھنا

کتنی دنیا سمٹ گئی انجم
اپنی چھت کو ہی آسماں لکھنا!

ہر روز نیا لگتا ہے بازارِ غزل میں
سجتا ہے نئے عہد کا دربارِ غزل میں

محنت ہے کڑی دھوپ ہے اس بارِ غزل میں
لکھا ہوں نئے طرز کے اشعارِ غزل میں

لگتی ہے غزل اور حسیں اور انوکھی
ہوتا ہے حقائق کا جب اظہارِ غزل میں

بہتا ہوا جھرنا ہیں یہ لفظوں کی نشستیں!
سرمست ہواؤں کی ہے گفتارِ غزل میں

اُڑتے ہیں جہاں گرم بگولے جو سروں پر
کرتا ہوں اُسی دشت کا اظہارِ غزل میں

احساس کہاں ہوتا ہے اب تیرہ شبی کا
رہتا ہے مرا یارِ ضیا بارِ غزل میں

اس دل کی تمنّا ہے کہ لکھتا ہی رہوں میں
ہوتا ہے مجھے آپ کا دیدارِ غزل میں

فنکار کا قد عشق سے کیوں ناپ رہے ہیں
یہ دیکھئے کیا کہتا ہے فنکارِ غزل میں

بے خوف و خطر آج کہو اپنی بھی انجم
جب رکھتے ہیں بات اپنی بھی گلنارِ غزل میں

جب خیالوں میں کوئی ہوش رُبا چلتی ہے
میرے آنگن میں بھی رنگین گھٹا چلتی ہے

رُوپ ایسا ہے گلابوں کو پسینہ آ جائے
چال ایسی ہے کہ مستانہ صبا چلتی ہے

کوئی یا دیدۂ تر یاد کیا ہے شاید!!!
جو مرے کان میں ہلکی سی صدا چلتی ہے

صرف سانسوں کا کھلونا ہے یہ ابن آدم
دیکھنا یہ ہے کہ کب تک یہ سزا چلتی ہے

لوگ قاتل کو بھی مقتول سمجھ بیٹھے ہیں
آج کل کیسی زمانے میں ہوا چلتی ہے

تپتے صحرا میں چلا جاتا ہوں ہنستے گاتے
سر پہ سائے کی طرح ماں کی دعا چلتی ہے

لوگ اب جان گئے ہیں تو ہے ردّی کاغذ!
ایسی حالت میں کہاں تیری انا چلتی ہے

ایسا لگتا ہے مرے دل کو لبھانے انجم
میرے آگے بھی کوئی ہوش رُبا چلتی ہے

ہم ہتھیلی پہ لے کر اُجالے گئے
لفظ گہرائیوں سے نکالے گئے

غم کے سیلاب آئے بہا لے گئے
کیا پتہ ساتھ اپنے وہ کیا لے گئے

دشمنوں میں ہماری بڑی ساکھ ہے
دوستوں میں ہمیشہ اُچھالے گئے

چاند تاروں کی پوشاک میں رات تھی
تجھکو کمخواب میں وہ سجا لے گئے

گنگناتے ہوئے گیت میرا کہار
اک حسیں پالکی میں بٹھا لے گئے

منہدم اک مکاں مجھ سے کہنے لگا
میرا سب کچھ پڑوسی چُرا لے گئے

چھٹ گئی تیرگی بھی اماوس کی
اُن کے چہرے کی ہم جو ضیا لے گئے

میرے سر پر تھی دستار جو اک نئی
کیا پتہ کون آخر چُرا لے گئے

کامیابی یقیناً تھی انجم مری
ساتھ ماں باپ کی جو دُعا لے گئے

کیوں دیتا ہے مجھ کو گالی
منہہ تیرا ہے گندی نالی

پھر مجھ پر الزام نہ دھرنا
کب دل ٹوٹا خالی خالی

ان جھگڑوں میں کیا رکھا ہے
تو مدراسی میں بنگالی

اک دن سب کی رائے بنے گی
مل کے منائیں عید دِوالی

اپنی کوئی مورت دے جا
من مندر ہے خالی خالی

میرے چمن کی مالن ہے تو
تیرے چمن کا میں ہوں مالی

دھیان میں میرے یوں کھوئی ہے
ٹوٹی چوڑی چھوٹی بالی

پھر موسم نے لی انگڑائی
مہک اُٹھی ہے ڈالی ڈالی
پنجابن لگتی ہے گوری
کون کہے گا سوُرت والی

رنگ نہ دیکھ آواز تو سُن لے
جب گاتی ہے کوئل کالی
تم اُس پر الزام دھروگے
انجم ہے انسان مثالی

○

اُن کی حسین سی ایک نظر ایک آن میں
پہلوئے دل میں عشق کی دُنیا بسا گئی
میرے الم کا قصہ میری داستانِ غم
میں کہہ رہا تھا اور انھیں نیند آ گئی

کیا بتاؤں میں تمہیں اور یہ کیا دیتی ہے
مفلسی سب کی نگاہوں سے گرا دیتی ہے

بھوک انسان کو مجرم بھی بنا دیتی ہے
حد سے بڑھ جائے تو یہ آگ لگا دیتی ہے

اس گرانی سے بچا ہے نہ بچے گا کوئی
یہ مصیبت تو کمر سب کی جھکا دیتی ہے

کتنے بیٹے ہیں یہاں "ماں" کو سکوں دیتے ہیں
ماں تو ہر حال میں بیٹوں کو دعا دیتی ہے

اس کے آگے تو سبھی طفل نظر آتے ہیں
اچھے اچھوں کو سبق زیست سکھا دیتی ہے

تو نے مسیحائی کی طاقت نہیں دیکھی شاید
ایک مجرم کو بھی انسان بنا دیتی ہے

آؤ فتوؤں کی دکانوں کو سبھی بند کریں
یہ دکانداری ہی معیار گھٹا دیتی ہے

ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے ہو کسی کی انجم
بھوکی سو جاتی ہے بچوں کو کھلا دیتی ہے

کسی کا رُوپ کسی کا سنگھار رقص میں ہے
گنوا کے دولتِ لیل و نہار رقص میں ہے

تم اپنے نام کی شادابیاں ہمیں دیدو
تمہارے نام سے جانِ بہار رقص میں ہے

مرے خلاف ترے دل کے گلستانوں میں
یہ کیسی گرد ہے کیسا غبار رقص میں ہے

تمہارا خط جو ملا یوں لگا کے تم آ دے
ہمارا آج دلِ سوگوار رقص میں ہے

تمہارے پیار کی خوشبو ہے میری سانسوں میں
میں معترف ہوں مرا اعتبار رقص میں ہے

کسی کے عشق میں کھو کر ہی خود کو پہچانا
اسی خوشی میں دلِ بیقرار رقص میں ہے

اسے گرانا، اُٹھانا اُسے حفیظ انجم
جہاں میں روز یہی کاروبار رقص میں ہے

وہ پُر فریب کبھی مسکرا بھی دیتا ہے
انانیت کی گھٹا کچھ گھٹا بھی دیتا ہے

تم اپنے طرزِ تغافل سے باز آؤ کبھی
بلاشبہ یہ نظر سے گرا بھی دیتا ہے

وہ جب بھی آتا ہے میرے غریب خانے پر
میں کیا بتاؤں مرا گھر سجا بھی دیتا ہے

مرے حریف کا شاید کمالِ فن ہو گا
غلط جگہ پہ صحیح فیصلہ بھی دیتا ہے

وہ زر خرید کسی کا غلام ہے شاید
اسی لئے تو غلط آنکڑا بھی دیتا ہے

وہ اُس کی فطرتِ ثانی ہے اور کچھ بھی نہیں
مرے خلاف تمہیں ورغلا بھی دیتا ہے

یوں لگ رہا ہے کہ انصاریوں کی بستی ہے
یہ دیکھنا ہے کوئی آسرا بھی دیتا ہے

روایتوں کا پجاری نہیں حفیظ انجم
وہ اپنی فکر کو لہجہ نیا بھی دیتا ہے

عجیب بات ہے وارفتگی ہے تھوڑی سی
کہ دشمنوں سے ابھی دوستی ہے تھوڑی سی

تمہاری طرح برستی نہیں کبھی کھُل کر
تمہاری یاد مگر اجنبی ہے تھوڑی سی

سفیر بن کے اُجالا اب آنے والا ہے
شبِ فراق ابھی رہ گئی ہے تھوڑی سی

میں ایسے چٹختے جنگل سے ہو کے آیا ہوں
ابھی بدن میں مرے کپکپی ہے تھوڑی سی

محبتوں کے چلو پھر گلاب مہکائیں
طبیعتوں میں ابھی برہمی ہے تھوڑی سی

میں انتقام کا جذبہ کبھی نہیں رکھتا
یہی تو مجھ میں بھی شاید کمی ہے تھوڑی سی

بروزِ عید مرے گھر جناب آتے ہیں
یہ رسم و راہ بچی رہ گئی ہے تھوڑی سی

زمانہ دیکھ نہ لے پونچھ لو حفیظ انجم
تمہاری آنکھوں میں اب تک نمی ہے تھوڑی سی

میرا الگ خدا ہے نہ اُس کا جُدا خُدا
اس راز سے تو پردہ اٹھا دے ذرا خدا

دنیا بڑی خراب ہے ایسی بنا خدا
سب کے دلوں میں ڈال دے خوفِ خدا خدا

سوئی بھی مانگنا ہے تو تو مجھ سے مانگ لے
قرآن میں یہ بول رہا ہے مرا خدا

کیوں دائروں میں قید ہے اپنے طلسم کے
انساں کی آج عقل کو کیا ہو گیا خدا

موسیٰ بھی کوہِ طور پہ بے ہوش ہو گئے
بس میں کہاں ہے سب کے تجھے دیکھنا خدا

بھنوروں کی گنگناہٹیں چڑیوں کی چہچہیں
گن گان کر رہے ہیں ترے نام کا خدا

جس طرح رنگ و بو ہے گلابوں میں مشک میں
کردار بھی ہمارے معطر بنا خدا

دل میں بھی تو ہی تو ہے مری سانس میں بھی تو
انجم پکارتا ہے مدد کو خدا خدا

تمام دُھند ہے گھرا ہے کیا کیا جائے
پھر اس پہ دور بھی جانا ہے کیا کیا جائے

مجھے یہ ڈر ہے کہیں پھر نہ صید ہو جاؤں
کسی نے جال بچھایا ہے کیا کیا جائے

ہر ایک فرد کے اندر جو سوکھا جنگل ہے
بغیر آگ کے جلتا ہے کیا کیا جائے

مری پسند مری ناپسند کچھ بھی نہیں
ترا خلوص ہی پیارا ہے کیا کیا جائے

اندھیری رات کے تنہا مسافروں سے کہو
کہ جگنوؤں پہ بھی پہرا ہے کیا کیا جائے

تھکن پروں میں نہیں دل میں ہے پرندے کے
اُداس ڈال پہ بیٹھا ہے کیا کیا جائے

شب سیاہ کا مارا ہوں میں انجم
ابھی تو دور سویرا ہے کیا کیا جائے

دل کی بستی میں مری آگ لگانے آئے
اور افسانے کو دلچسپ بنانے آئے

میرے خوابوں کو حقیقت وہ بنانے آئے
اور سج دھج کے مرے ہوش اڑانے آئے

نئی کونپل نئے پھولوں کے زمانے آئے
زندگی ہم بھی ترے ناز اٹھانے آئے

کیا بتاؤں میں تمہیں وحشت دل کا عالم
آپ بھی سچ کو مرے جھوٹ بتانے آئے

پیار کہتے ہیں جسے ناؤ ہے اک کاغذ کی
بیچ منجدھار میں کیوں آپ بہانے آئے

اس بلندی سے گروگے تو نہ بچ پاؤگے
ہم تمہیں اپنا سمجھ کر ہی بتانے آئے

تہمتیں تھوپ کے اپنے وہ سبھی اوروں پر
خود کو اخلاص کی تصویر بتانے آئے

عارض گل پہ چمکتے ہیں جو موتی انجم
اپنی پلکوں سے بصد شوق اٹھانے آئے

آگ بھی روپ ہے اک چھوٹی سی چنگاری کا
موت درماں ہے یہ دکھ درد کا بیماری کا

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے میں ہٹوں میداں سے
کھیل کر جاؤں گا میں کھیل مری باری کا

میں نے ہر روپ میں چاہا ہے سراہا ہے اسے
ماں بہن بیوی بھی ہے روپ اسی ناری کا

میرا گھر آج مہکتا ہے اسی خوشبو سے
میرے آنگن میں کھلا پھول سمجھداری کا

اُس کے پیمانۂ اقدار کا اب کیا ہوگا
نام لیتا ہی نہیں کوئی بھی سرداری کا

اس میں اب گاؤں کی مٹی کی کہاں ہے خوشبو
اب یہ بندہ ہے بناوٹ کا ریا کاری کا

نا سمجھ اتنا نہیں جتنا نظر آتا ہے
سائباں رکھتا ہے وہ اپنا سمجھداری کا

جھوٹ پر اس کی ہنسی آتی ہے مجھکو انجم
جب وہ کہتا ہے نمونہ ہوں میں خودداری کا

سرد مہری سے فائدہ کیا ہے
اس سے حاصل تجھے ہوا کیا ہے

تیرے آگے کھلی کتاب ہوں میں
میرے بارے میں سوچتا کیا ہے

کیوں کسی کا اُڑا رہا ہے مذاق!
یہ بھلا ہے تو پھر بُرا کیا ہے

چند سانسیں ہیں اور کچھ بھی نہیں
زیست اور موت میں دھرا کیا ہے

آپ غیبت مری نہیں کرتے
دوست ہونے کا فائدہ کیا ہے

کھیل سارے یہاں اُسی کے ہیں
کیا بتاؤں تمہیں خدا کیا ہے

چاند تاروں سے گھر سجایا ہوں
وہ نہ آئیں تو پھر مزا کیا ہے

درد کے لُطف سے میں واقف ہوں
مجھکو انجمؔ دُعا دوا کیا ہے

خلوت پسند ہوں نہ میں جلوت پسند ہوں
میرا ضمیر زندہ ہے میں سربلند ہوں

ہر بات پر جناب کی میں "ہاں" نہ کہہ سکا
شاید اسی لئے میں انہیں ناپسند ہوں

محنت کی روٹیاں بھی نہیں نعمتوں سے کم
پروردگار تیرا میں احسان مند ہوں

چھت پر کھڑے مکان کے کہتا تھا اک بشر
اے آسمان دیکھ میں کتنا بلند ہوں

ٹکتے نہیں ہیں پیر برابر زمین پر !
جب سے میں آسمانوں پہ ڈالا کمند ہوں'

نفرت کی بیڑیوں کو چلو مل کے توڑ دیں
احساس جب سے جاگا ہے میں فکر مند ہوں

کچھ زخمی حسرتوں کے دلاسے بھی ساتھ ہیں
انجم اسی خیال سے میں مند مند ہوں

بے بسی ہے بیکسی ہے بے کلی ہے آج کل
ایک اک لمحہ بھی گویا اک صدی ہے آج کل

ہو گئے ہیں دور حق سے اور باطل کے قریب
کس قدر بے معنی اپنی زندگی ہے آج کل

عیش و عشرت کے پجاری ہوش کے ناخن تو لے
کیوں ترے چہرے پہ چھائی مُردنی ہے آج کل

ہر طرف ہے شورِ ماتم کیا کہوں میں الاماں
زندگی بھی زندگی کو چیختی ہے آج کل

جاؤ آنکھوں کے جزیروں میں پناہیں ڈھونڈ لو
صبح کاذب دھند میں لپٹی ہوئی ہے آج کل

تشنہ دن ہیں تشنہ راتیں تشنہ ہیں دیوار و در
روح میں دل میں نظر میں تشنگی ہے آج کل

کان اپنے پیار کے نغمات سے محروم ہیں
ہمدموں بے ساز اپنی زندگی ہے آج کل

صید سے اپنے یہ انجم پوچھتا صیاد ہے
خوش نوا طائر بتا تو کیوں دکھی ہے آج کل

ایک اک لمحہ کا جینا بھی یہاں بھاری ہے
ہر طرف دیکھئے بیزاری ہی بیزاری ہے

اور کچھ دیر ٹھہر جا کے نشہ اترے گا
زندگی تیرا نشہ مجھ پہ ابھی طاری ہے

خوابِ غفلت میں ابھی تک ہے زمانہ سویا
آپ کہتے ہیں کہ انسانوں میں بیداری ہے

جو بھی مل جائے اسی پر ہے قناعت کرنا
یہ بھی اک طرزِ عبادت ہے یہ خودداری ہے

ہم نے موسم کی طرح لوگ بدلتے دیکھے
یہ تو کم ظرفی ہے عیاری ہے مکاری ہے

میرا دل بھی ہے حسیں دیکھئے اک بندرابن
رادھکا میرے تخیل کی بڑی پیاری ہے

اعتبار اٹھ چکا الفت کا جہاں سے انجم
اک تصنع ہے بناوٹ ہے اداکاری ہے

کوئی دل کا یہاں دھنی ہی نہیں
آدمیت سے آگہی ہی نہیں

جانے کہتا ہے کیا اناپ شناپ!
بات اس کی سمجھنے جیسی ہی نہیں

میرے اندر تو شورِ ماتم ہے
خامشی میری خامشی ہی نہیں

لوگ مطلب پرست ہیں سارے
کوئی بے لوث آدمی ہی نہیں

زیست ایسی پتنگ ہے میری
جو ابھی تک کٹی پھٹی ہی نہیں

دوست بھی اس سے کچھ نہیں ہیں کم
دھوکا دیتے ہیں لومڑی ہی نہیں

اب کہاں خیر و عافیت انجم
جی رہے ہیں مگر خوشی ہی نہیں

خیال و فکر کے ہوتے ہیں فلسفے بھی نئے
نئی غزل کیلئے لائیں قافیے بھی نئے

جدید زخموں کی کس کو یہاں ضرورت ہے
پرانے زخم جو دینے لگے مزے بھی نئے

دل و دماغ اندھیروں میں سانس لیتے ہیں
لگا رہے ہیں مزاروں پہ قمقمے بھی نئے

تھکن کا نام نہیں ہے ہمارے ماتھے پر
ہمارے ساتھ جو رہتے ہیں ولولے بھی نئے

میں منتظر ہوں ابھی وقت کی عدالت کا
کچھ اور ہوں گے نمودار فیصلے بھی نئے

نئی اڑان پہ نکلے ہو بال و پر ہی نہیں
یوں لگ رہا ہے مجھے تم ہو سر پھرے بھی نئے

میں کس کی بات سناؤں میں کس کا ذکر کروں
محاسبے بھی نئے ہیں مباحثے بھی نئے

مجھے یہ ڈر ہے چکاچوند میں نہ کھو جاؤں
یہ راستے بھی نئے ہیں یہ رابطے بھی نئے

جدیدیت کا زمانہ ہے یہ حفیظ انجم
ہیں آج کل تو ریاضی میں ضابطے بھی نئے

نہ شادابیاں ہیں نہ ویرانیاں ہیں
عجب کشمکش ہے پریشانیاں ہیں

مرے دل کی حالت تمہیں کیا بتاؤں
سمندر میں جیسے کہ طغیانیاں ہیں

بڑی خوبصورت وہ دانائیاں تھیں
بڑی خوبصورت یہ نادانیاں ہیں

کسی کی کوئی آج سنتا نہیں ہے
جدھر دیکھتا ہوں میں من مانیاں ہیں

شرافت سخاوت عبادت نہیں ہے
مرے دور کی کیسی سیدانیاں ہیں

مراسم الگ ہیں عقیدت الگ ہے
مگر آپ کو کیوں یہ حیرانیاں ہیں

مری کوششوں پر کرم ہو گیا ہے
مقدر میں میری جو تابانیاں ہیں

نہ دل بھولتا ہے نہ ہم بھولتے ہیں
ہمیں یاد تیری وہ مہمانیاں ہیں

تھکن میرے ماتھے پہ اب تک نہیں ہے
میری خو میں شامل جو جولانیاں ہیں

آج میدانِ مسائل سے نکلنا ہوگا
اس بُرے وقت کو ہر حال میں ٹلنا ہوگا

اب لباسِ غمِ ہستی کو بدلنا ہوگا
آتشِ ہجر میں تیری مجھے جلنا ہوگا

لوگ اوروں کی بُرائی پہ نظر رکھتے ہیں
پہلے خود اپنی بُرائی کو کچلنا ہوگا

گندی گندی ہیں تصاویر چھپی پردوں پر
در و دیوار کے پردوں کو بدلنا ہوگا

آپ محنت نہ کریں گے تو سنو یاد رکھو!
عمر بھر اوروں کے ٹکڑوں پہ ہی پلنا ہوگا

میں وہ انسان ہوں جو جھوٹ نہیں کہہ سکتا
مجھ کو تلوار کی اب دھار پہ چلنا ہوگا

پیڑ سوکھا ہے پرندہ بھی نہیں ٹہنی پر
دھوپ شدت کی ہے تنہا اسے چلنا ہوگا

جلتی آنکھوں میں کوئی خواب نہیں آسکتا
یوں ہی رو کر ہی سہی دل کو بہلنا ہوگا

میری آواز سنائی نہ اگر دے تم کو!!
خود ستائی کے گھروندے سے نکلنا ہوگا

اب محافظ تمہیں بننا ہے خود اپنا انجم
وقت کہتا ہے کہ ہر روپ میں ڈھلنا ہوگا

اس کو جنت کے نظاروں کی ضرورت کیا ہے
جس کو آجائے میسّر ترے رخسار کی صبح

رات بھر مجھ پہ تھا اک نزع کا عالم طاری
بڑی مشکل سے ہوئی اس دلِ بیمار کی صبح

تیشۂ وقت جب بھی چلتا ہے   دل دہلتے ہیں کوہساروں کے
زندگی کا بھی کچھ تعارف ہو   ساتھ تشبیہ استعاروں کے
جوں ہی کھولا ہے شب نے بندِ قبا   کھل گئے راز ماہ پاروں کے

دُور جانے کی بات کرتے ہو
کیوں ستانے کی بات کرتے ہو

اُن کا آیا نہیں جواب ابھی
گھر سجانے کی بات کرتے ہو

دولت علم بھی خزانہ ہے
کس خزانے کی بات کرتے ہو

مُنہ سے اُف تک کہا نہیں جاتا
ورغلانے کی بات کرتے ہو

آنسوؤں کی یہ بوندا باندی ہے
بھیگ جانے کی بات کرتے ہو

دشمنی آپ کی ہے رگ رگ میں
دوستانے کی بات کرتے ہو

تپتا صحرا ہے زندگی اس کی
گل کھلانے کی بات کرتے ہو

نیک نامی بچی کچھی اپنی
کیوں گنوانے کی بات کرتے ہو

حد تو یہ ہے کہ زہد و تقویٰ بھی
بیچ کھانے کی بات کرتے ہو

عشق چھپتا نہیں چھپانے سے
کیوں چھپانے کی بات کرتے ہو

جس کو اپنی خبر نہیں انجم
اس دوانے کی بات کرتے ہو

آنکھ رکھتے ہوئے ہیں دیکھنے والے کتنے
دورِ حاضر کے ہیں انسان نرالے کتنے

ایک انسان کو انسان سمجھ کر انجم
گردشوں میں بھی ہیں پہچاننے والے کتنے

دامن میں آگ اپنے لگائے ہوئے ہیں لوگ
آپس میں رنجشوں کو بڑھائے ہوئے ہیں لوگ

طغروں سے اپنے گھر تو سجائے ہوئے ہیں لوگ
دل سے خدا کا خوف بھلائے ہوئے ہیں لوگ

لے کر سروں پہ اپنے گناہوں کی گٹھریاں
دیکھو کرم کی آس لگائے ہوئے ہیں لوگ

دنیا کھڑی ہے بن کے جو دیوِ شرر سامنے
اور ہوش اپنے اپنے اڑائے ہوئے ہیں لوگ

جو مال و زر کو دھول سمجھتے تھے پاؤں کی
وہ آج بھی قلوب پہ چھائے ہوئے ہیں لوگ

رہنا تھا ایک ہو کے جماعت میں بٹ گئے
مسجد الگ الگ سی بنائے ہوئے ہیں لوگ

باطل کی ایک ایک ادا پر نثار ہیں
انجم ندائے حق کو بھلائے ہوئے ہیں لوگ

دل ہیں سیہ سیاہ تو چہرے شفق شفق
دنیا کی عشرتوں پہ انھیں کا ہے آج حق
جی چاہتا ہے اسکو کتابوں کی شکل دوں
ہر آدمی سے مجھکو ملا جو نیا سبق
اے دوست دوست کہنا تو آسان ہی بہت
کیا تو بھی کر سکے گا ادا دوستی کا حق
چہرے کی جھریاں ہی نہیں تجربہ اے دوست
تاریخِ زندگی کے مضامین ہیں ادق
ہر گام کامیابی نے چومے قدم مرے
آلام و نامرادی کے چہرے ہوئے ہیں فق
آؤ کہ زندگی کو نئے ساز پر سنیں!
شاید طناب دل کا یہ ہو جائے کم قلق
بے معنی لگ رہی ہے یہ سج دھج جہان کی
انجمؔ لہو لہان ہے دل کا ورق ورق

تیری شادی میں ضرور آؤں گا رقعہ دینا
شرط ہے اپنے ہی تو ہاتھ کا لکھا دینا

لاکھ سونے کا سہی پنجرہ تو پنجرہ ٹھہرا
دل کے پنچھی کو مرے پاس ہی لوٹا دینا

بیل پھولوں سے لدی ہے تو بھلی لگتی ہے
پیڑ کانٹوں کا ہو آنگن میں تو کٹوا دینا

مندمل ہونے سے پہلے یہ گہر زخموں کے
پھر کوئی زخم مجھے تازہ بہ تازہ دینا

اس سے پہلے کہ وہ دیمک کی غذا بن جائے
میرا لکھا ہوا دیوان مجھے لوٹا دینا

یہ فلک بوس عمارات ہیں کالے دھن کی
اے خدا مجھکو سکوں بخش گھروندا دینا

کیوں اندھیروں میں گلا گھونٹ رہے ہو میرا
مجھکو جلنے کی سزا میرے مسیحا دینا

نفرتیں ساری زمانے کی دھری رہ جائیں
اسکے ہاتھوں میں محبت کا صحیفہ دینا

خالی خالی ہوں بہت دل کو گنوا کر انجم
آج آئے ہو مرے پاس تمہیں کیا دینا

مری پسند کا کپڑا ابھی تو تھان میں ہے
وہ تھان شہر کی سب سے بڑی دکان میں ہے
نہ مانگ ہے نہ ضرورت ہے آجکل اس کی
مرا خلوص مرے گھر کے برف دان میں ہے
تم اپنی بات کہو، اپنی بات منواؤ!
نہ خاندان میں رکھا نہ پان دان میں ہے
یہ سوتی ساڑی ہے کیسے پسند آئے گی
تمہاری آرزو پہلے ہی سے کمان میں ہے
جوان بیٹا بہو سب مرے سے گھر میں ہیں
یہ بوڑھی ماں ہے اکیلی جو سائبان میں ہے
اب ایرے غیرے بھلا کس شمار میں ہونگے
بلا کا جھوٹ ہمارے ہی پاسبان میں ہے
یہ دیکھنا ہے کہ اُترے گا آسمان سے کب
ترے غرور کا پنچھی ابھی اُڑان میں ہے
ہر ایک فرد کا کہنا ہے یہ حفیظ انجم
حسد کا روگ ہمارے ہی خاندان میں ہے

ماں

میری پیاری پیاری ماں
نہیں یہاں پر تجھکو اماں
یاد مجھے آتا ہے ہر دم!
مٹی کا وہ اپنا مکاں
لال لال مٹیا نے گھر میں!
چولہا چکی اور پلنگ
چولہے کا وہ دھواں دھواں
پھونک پھونک کر تھک جانا
موٹا چاول کھاتے تھے
موٹا کپڑا پہنتے تھے
لب پہ ہمارے شکر خدا تھا
لب پہ ہمارے نام خدا تھا
تم تھیں اور ابو بھی تھے
گھر یہ نہیں اک جنت تھا
ممتا کی چھپر چھایا میں!
خوب پلا میں خوب بڑھا

تم دونوں کیا چلے گئے!
شیرازہ ہی بکھر گیا
اب بلڈنگ میں رہتا ہوں
اور کاروں میں پھرتا ہوں
سوٹ اور بوٹ پہنتا ہوں
اچھا کھاتا پیتا ہوں
لیکن وہ دن رات کہاں
خوشیوں کی بارات کہاں
خوشیوں کی برسات نہیں
خوشیوں کی سوغات نہیں
سانس سانس میں پھانس ہے اب
جینا کسکو راس ہے اب
میری پیاری پیاری ماں
نہیں یہاں پر تجھکو اماں

اُردو

میں یہاں ہوں وہاں ہوں ہر سُو ہوں
میں ہی شیریں زبان اُردو ہوں
نہ میں مسلم ہوں اور نہ ہندو ہوں
میں تو اُردو ہوں بھینی خوشبو ہوں
میں غزل، گیت اور ٹھمری بھی
ایک میٹھی صدا ہوں گھنگرو ہوں
جو اُترتا نہیں کبھی سر سے!
ایک ایسا خمار، جادُو ہوں
مجھ میں صدیوں کے المیے ہیں نہاں!
یہ نہ سمجھو کہ صرف ہاؤ ہو ہوں
ہر زمانے میں ہوں ستائی گئی!
ایک مظلوم ہوں میں اُردو ہوں
چاہنے والے میرے ہر سو ہیں
میں جو لیکر ہزار پہلو ہوں
سب کی تنہائیاں سجاتی ہوں
مجھ کو مُٹھی میں رکھ میں جگنو ہوں
عشق مجھ سے بھی کرکے دیکھ انجم
چشم حیرت ہوں چشم آہو ہوں

عیدِ کا دن

ہتھیلیوں کو سجاؤ کہ عید کا دن ہے
حِنا کا رنگ چڑھاؤ کہ عید کا دن ہے
گلے سبھی کو لگاؤ کہ عید کا دن ہے
دلوں سے بُغض مٹاؤ کہ عید کا دن ہے
در و دِوار سجاؤ کہ عید کا دن ہے
خوشی کے جام چڑھاؤ کہ عید کا دن ہے
غموں کو بھول ابھی جاؤ کہ عید کا دن ہے
ہنسو بھی اور ہنساؤ کہ عید کا دن ہے
سبھی کو دوست بناؤ کہ عید کا دن ہے
خوشی سے تان لگاؤ کہ عید کا دن ہے
کچھ ایسی عید مناؤ کہ عید کا دن ہے
تم آج خود کو بھلاؤ کہ عید کا دن ہے

جناب جھوم کے گاؤ کہ عید کا دن ہے
کچھ انجم آج سُناؤ کہ عید کا دن ہے

گیت

بول پیار کے بول سکھی ری
میں ڈولوں تو ڈول سکھی ری
پی کے بنا ہے جیون سُونا
بھید یہ من کا کھول سکھی ری
اُمڈ رہا نینوں میں ساگر
دیکھ نہ لے ماحول سکھی ری
ساون بھادوں آنے کو ہے
سجنا سے جا بول سکھی ری
میں تو پیا کی پریم دوانی!
میرا پیا انمول سکھی ری
تو کیا سمجھے تو کیا جانے
میرے پیا کا مول سکھی ری
بھیتر بھیتر ٹوٹ رہی ہوں
میرے پیا سے بول سکھی ری
گیت سنا کے انجم کے تو
کانوں میں رس گھول سکھی ری
بول پیار کے بول سکھی ری
میں ڈولوں تو ڈول سکھی ری

جانِ غزل

میرے دل کا قرار لگتی ہے — وہ غزل کا نکھار لگتی ہے
جانِ جاں جاں نثار لگتی ہے — زیست اب خوشگوار لگتی ہے
ساری شادابیاں سمیٹے ہوئے — وہ مجھے وضعدار لگتی ہے
پھول چُنتی ہوئی وہ دامن میں — مسکراتی بہار لگتی ہے
اپنی پازیب چھنچھناتی ہوئی — مجھکو بادِ بہار لگتی ہے
برف کے پھول ہیں جو بالوں میں — دلنشیں دل فگار لگتی ہے
خواہشوں کے اُداس جنگل میں — اِک خوشی اِک پھوار لگتی ہے
شہرِ دل اُس کو میں نے سونپ دیا — وہ مرا اعتبار لگتی ہے
عکس اُبھرا ہے اُس پری وش کا — نظم یہ شاہکار لگتی ہے

جو اُترتا نہیں کبھی انجمؔ
ایک ایسا خمار لگتی ہے

آزادی

آفریں آفریں ہے آزادی
یوں ہی ملتی نہیں ہے آزادی
سینکڑوں جانیں ہم گنوائے ہیں
تب کہیں جا کے اسکو پائے ہیں

آج پورے پچاس سال ہوئے
ساری دنیا میں بے مثال ہوئے
باپو نہرو تھے یہ اہنسائی
اُن کی محنت کی ہے یہ صناعی

سب کے سب ایک ہو کے کود پڑے
خوف سے سب فرنگ بھاگ کھڑے
اندرونی جو انتشار ہے اب
کر کے رکھ دیگا یہ خراب سب

اب ہمیں دیش کو بچانا ہے
راہِ حق پر سبھی کو لانا ہے
ایک دوجے کا درد سہنا ہے
ہمکو مل جُل کے ساتھ رہنا ہے

سب مذاہب سے پیار کرنا ہے
خامیوں پر ہی وار کرنا ہے
خواب کتنے ابھی ادھورے ہیں
آؤ مل جل کے پورے کرنے ہیں
گاندھی نہرو، ابوالکلام گئے!
ہمکو لینا ہے اُن کے روپ نئے
دیش کی شان اور بڑھانا ہے
اپنے کردار سے سجانا ہے
جنم بھومی جو یہ ہماری ہے
انجمؔ ہمکو یہ جاں سے پیاری ہے
آفریں آفریں ہے آزادی
یوں ہی ملتی نہیں ہے آزادی

شاطرِ وقت!

کھوٹے ہو حقیقت میں بظاہر تو کھرے ہو
افسوس مرے آگے ابھی تن کے کھڑے ہو
خوں حاشیہ برداروں کا کیوں چوس رہے ہو
کیوں اپنے شکنجہ میں دِوانوں کو کَسے ہو
تم دوست کسی کے نہ کوئی دوست تمہارا!
ماں باپ بہن بھائی کسی کے نہ سگے ہو
تعلیم الگ چیز ہے تہذیب الگ ہے
ہو سکتا ہے کچھ ہم سے بھی زیادہ ہی پڑھے ہو
نکلے گا جنازہ بھی حماقت کا تمہاری!
ہر وقت حماقت میں ہی تم چور رہے ہو
ہر شخص حقارت سے تمہیں دیکھ رہا ہے
ہر کام رعونت سے تغافل سے کیے ہو
مرواؤ گے اک روز انھیں مجھکو یقیں ہے
ناسمجھوں کی ٹولی کے جو سردار بنے ہو
درویش بنے پھرتے ہو رچتے ہوئے سازش
اخلاص و محبّت کو زمانے سے تجے ہو

ہوشیار دغاباز ہو عیّاروں کے عیّار!
دو ہاتھ سے دُنیا کے مزے لوٹ رہے ہو
تم کیسے بھلا مرد ہو افسوس ہے تم پر!
ہر وقت طوائف کی طرح سجنے لگے ہو
انسانوں کے کام آنا بھی ہے ایک عبادت
انجم کا ترانہ یہ کسی دن تو پڑھے ہو

بیگانۂ دیں شیخِ حرم ہے تو مجھے کیا
برسوں سے ہم آغوشِ صنم ہے تو مجھے کیا
شاہوں کو جھکا سکتی ہے جب میری گدائی
تجھ کو تری دولت کا بھرم ہے تو مجھے کیا
میں جتنا لُٹا ہوں کوئی کیا خاک لُٹا ہے
"یہ بھی تری اُمید سے کم ہے تو مجھے کیا"

غزل

کسی کو دوست بنانا کوئی مذاق نہیں
پھر اُس کے عیب چھپانا کوئی مذاق نہیں

خوشی سے آنکھ چرانا کوئی مذاق نہیں
غموں سے ہاتھ ملانا کوئی مذاق نہیں

میں جانتا ہوں تجھے تو ہی میرا دشمن ہے
بھلا کے سر پہ بٹھانا کوئی مذاق نہیں

زمیں میں تخم کا بونا بہت ہی آساں ہے
ہاں اُس کا پیڑ بنانا کوئی مذاق نہیں

دلوں میں آگ لگانا تو سہل ہے لیکن
دلوں کی آگ بجھانا کوئی مذاق نہیں

ہم اپنا گھر تو بنا بھی چکے مشقت سے
اب اِس میں بسنا بسانا کوئی مذاق نہیں

ہم ایسے دور میں بھی اپنے بال بچوں کو
حلال رزق کھلانا کوئی مذاق نہیں

جہاں پہ ریت ہو، صحرا ہو اور کچھ بھی نہ ہو!
وہاں گلاب کھلانا کوئی مذاق نہیں

خود اپنے آپ کو جھلسا کے آگ میں انجم
عدو کی جان بچانا کوئی مذاق نہیں

سانس لینا بھی جہاں میں ہو گیا دشوار کیوں
آدمیت کا نہ جانے گر گیا معیار کیوں
ایک چھوٹی سی گذارش ہے مری بس آپ سے
صرف غیبت چھوڑنے سے ہے بھلا انکار کیوں
اس طلسمی آئینے میں کچھ نظر آتا نہیں!
بات سیدھی صاف ہے تکرار کیوں گفتار کیوں
ٹھوکریں کھا کر بھی ہر دم زندگی کی راہ میں
ٹوٹنے کا نام ہی لیتا نہیں پندار کیوں
ہر نفس اک جنگ ہے اندر مرے افکار کی!
دے نہیں پاتا ہوں انکو آج تک آکار کیوں
امن پر بھاشن ہوا اتھا رات بھر نیتاؤں کا
خون میں لت پت ملا ہے صبح کا اخبار کیوں
زندگی کا بوجھ ڈھونا آ گیا انجمؔ ہمیں!
زندگی سے خوف کھائیں ہم بھلا بیکار کیوں

●

جو بھی محنت سے جی چراتے ہیں
پھل انھیں ذائقہ نہیں دیتے
کوئی مانگے بغیر ہی اپنا!
ہم انھیں مشورہ نہیں دیتے

محبتوں کا ہے جلتا دیا مرے اندر
تمام عمر اُجالا رہا مرے اندر
میں جھلملانے لگا ہوں جو سر سے پیروں تک
یہ کس حسین کا ہے نقشِ پا مرے اندر
کوئی سُنے تو کلیجہ ہی کاٹ کر رکھ دے
ہیں کربناک صدائیں سدا مرے اندر
ترے خیال کا پرتو ہے اور کچھ بھی نہیں!
جو مثلِ مشک مہکتا رہا مرے اندر
میں تند و تیز ہواؤں سے ڈر نہیں سکتا!
چٹان سا ہے کھڑا حوصلا مرے اندر
میں دیکھنے میں بڑا پُر سکون لگتا ہوں
نفس نفس میں ہے اک حادثا مرے اندر
ٹھٹھرتے وقت کی بیکل صدا ہوں میں انجم
عضو عضو ہے مرا چیختا مرے اندر

●

تیری آواز تیری پائل کو
سونچتا ہوں کہاں کہاں سے سنوں

آپ کی جب تک ذرا بھی جستجو ہوتی نہیں
زندگی تب تک یقیناً سرخرو ہوتی نہیں

دربدر کیوں پھر رہے ہو تج کے اپنی اصلیت
خواہشِ دل اسطرح تو سرخرو ہوتی نہیں

کچھ کھنچے رہتے ہیں وہ بھی کچھ کھنچے رہتے ہیں ہم
روز و شب ملتے ہیں لیکن گفتگو ہوتی نہیں

یہ خیالوں کا رچاؤ کس طرح مل پائے گا
تیری میری شکل بھی جب ہو بہو ہوتی نہیں

ہم جدا تو ہو گئے ہیں سسکیوں کے درمیاں
کیوں ملن کی بات کوئی روبرو ہوتی نہیں

ریت کے ٹیلے کو ہم نے ریت کا ٹیلہ کہا!
اسلئے شہرت ہماری چارسو ہوتی نہیں

نیک نامی کی یہ چادر پھٹ گئی جو ایک بار
اتنی آسانی سے انجم یہ رفو ہوتی نہیں

●

نہ بھوک ہوگی مجھے اب نہ پیاس ہی انجم!
مرے لئے کوئی اردو کتاب رکھ دینا

یہ مسئلہ تو تمہاری نہ میری آن کا ہے
یہ مشغلہ تو حقیقت میں جھوٹی شان کا ہے
دراز قد کو جو دیکھا تو تیرے، دل نے کہا!
یہ ایک پیڑ حقیقت میں ساگوان کا ہے
وہ آج خوش ہیں گلے بھی لگا رہے ہیں ہمیں
یہ جشن سارا گلابی نئی کتان کا ہے
مرا لباس الگ ہے ترا لباس الگ
مگر یہ سچ ہے کہ کپڑا اُسی دکان کا ہے
بڑے ہی شوق سے سنتے ہیں سب ہی غزلوں کو
ہر ایک فرد کو چسکا مری زبان کا ہے
پروں کو نوچ دیا وقت نے تو کیا ہے ڈر
ہمارا کام ہمیشہ نئی اُڑان کا ہے
مدد وہ دے گا مگر اپنی ہی شرائط پر
شکست ہو گی تری پل یہ امتحان کا ہے
ازل سے محوِ سفر ہوں میں آج تک انجم
سفر طویل ہے رستہ بڑی تھکان کا ہے

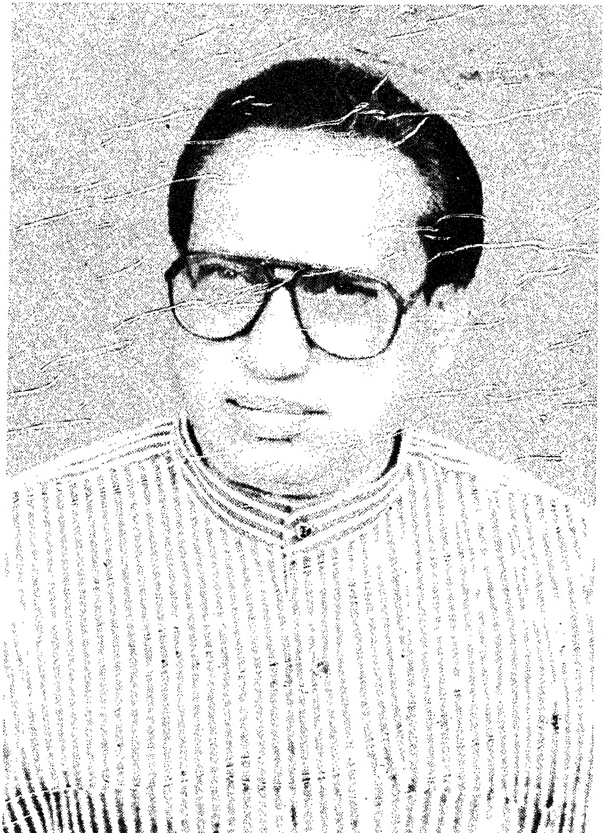
روپ کا رسیا روپ چرانے آیا ہے
بن گھنگرو کے ناچ نچانے آیا ہے
شر کا بچاری شر پھیلانے آیا ہے
آپس میں ستو بار لڑانے آیا ہے
فطرت اس کی پا کھنڈی ہے جان گیا
خاموشی میں شور مچانے آیا ہے
دریا دریا گھوم رہا تھا اٹھلاتا!
پنگھٹ پہ کیوں پیاس بجھانے آیا ہے
اونچائی پہ کل جو ہمیں بٹھایا تھا!
اونچائی سے آج گرانے آیا ہے
موت کے سائے گھوم رہے ہیں چار طرف
کیوں مقتل میں رات بتانے آیا ہے
لڑنا ہے تو اپنے بل بوتے پر لڑ!
کیوں مجھ کو ہتیار بنانے آیا ہے
لفظوں کا ادراک نہیں ہے وحشی کو
لہجے کی گھن گرج سنانے آیا ہے
سیرت کو میری روند کے انجم پاؤں تلے
آج مجھے من میت بنانے آیا ہے

ہونٹوں پہ تبسم ہے بالوں میں بھی گجرا ہے
پردیس سے کیا کوئی گھر لوٹ کے آیا ہے
دنیا کا "نیئم" ہے یہ دنیا کا طریقہ ہے
چڑھتے ہوئے سورج کو کس نے نہیں پوجا ہے
جو میری ہتھیلی پر اک سرخ شرارہ ہے
محنت کا مشقت کا یہ چاند کا ہالہ ہے
لفظوں کی حنا بندی سیکھے تو کوئی ہم سے
ہر لفظ سنہرا ہے ہر شعر روپہرہ ہے
ماں نے جو محبت سے اک بار جو چوما تھا
پیشانی کا میری وہ چمکیلا ستارہ ہے
آتے ہیں سمندر میں کیوں مد و جزر اتنے
کیا تیرا سراپا تھا کیا تیرا سراپا ہے
سکھ چین میسر ہوں پھر کیسے ہمیں آخر؟
جس سمت نظر ڈالیں بس خون خرابہ ہے
وہ صبح بنارس ہو یا شام اودھ انجم
ہر روپ میں دیکھا ہے ہر روپ میں چاہا ہے

کچھ نہ کچھ سیکھ لو اب تم بھی دکھاوا کرنا
آج یہ فن ہے ضروری ہے ہمیشہ کرنا
کوئی بتلائے ذرا اور بھی کیا کیا کرنا
ہم سے ہوتا ہے کہاں خون اپنا سستا کرنا
یہ دکھاوا ہے تماشہ ہے زلیخائی کا!
آپ چاہیں تو کوئی کھیل انوکھا کرنا
ہم نے دیکھی ہی نہیں آپ کی تاناشاہی!
آپ کہتے ہیں تشخص کا خلاصہ کرنا
میں کوئی باندھ نہیں ہوں جو ٹھہر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں مجھے آتا ہے رستہ کرنا
اس کی بن جاتی ہے کیوں ساری خدائی دشمن
"کتنا دشوار ہے سچ کہہ کے گذارا کرنا"
خود کو مصروف دکھا کرتے ہیں ہم تو انجم
ہم نے سیکھا ہی نہیں خود کو نکما کرنا

●

تیری کوٹھی بہت حسین سہی
زرد چہرے میں گھر کے دیکھ لیا



حفیظ انجم کریمنگری